چُپ
بُشریٰ رحمٰن

(افسانے)

بشریٰ رحمن

ISBN : 81-88508-15-2

Chup (Short Story)
By.: Bushra Rehman
Price : Rs.160/=
Edition : 2006
Himanshu Publication
F-U6, Pitam Pur, Vishakha Enclave,
New Delhi-110025
Ph.: 28715142, 28715987 (P.P.)
27342921 (R)
Mob.: 9818441306

افسانے : چُپ
مصنف : بشریٰ رحمٰن
سن اشاعت : ۲۰۰۶ء
قیمت : =/۱۶۰ روپے
مطبوعہ : فائن آفسیٹ پریس، شاہدرہ، دہلی۔32
ناشر : آہلوالیہ بک ڈپو، 9988۔ نیو روہتک روڈ،
گلی نمبر 6، سرائے روہیلہ، پی او بکس 2507،
نئی دہلی۔110005

انتساب:

اس چُپ کے نام......

جو ہر جگہ بولتی رہی !!

کون ہے تو اے بشریٰ بی بی
ناحق شور مچاتی ہے
دل تیرا ہے خالی برتن
اس کو عبث بجاتی ہے

چُپ

☆☆☆

ساون کی پہلی بارش کی طرح خوبصورت.....

بہار کے پہلے پھول کی طرح تروتازہ..........

اور محبت کے پہلے آنسو کی طرح پرسوز..........

بشریٰ رحمٰن کے افسانے!

چُپ کی داد

''عورت پامال ہونا پسند نہیں کرتی' صرف دل کے آگے ہار مانتی ہے' دل اُسے کمزور کر دیتا ہے' اس کا دل ہمیشہ محبت اور مامتا کے آگے سرنگوں رہتا ہے۔ ضروری نہیں کہ عورت کی نفی کر کے اور اس کو ذلیل کر کے اپنے آگے جھکایا جائے۔ اسے جھکانے اور سجدے کروانے کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔ جب اس کی ہستی کو تسلیم کر لیا جائے تو بلی کی طرح آ کر پاؤں میں بیٹھ جاتی ہے۔ پھر اگر ٹھڈا بھی لگائیں تو غزاتی نہیں۔ محبت کے عہد کو نباہنے کے لیے اپنے نفس کی تربیت کرنا پڑتی ہے اور اپنی فطری جبلتوں کی مہار اپنے ہاتھ میں رکھنی پڑتی ہے......''

بشریٰ رحمٰن!

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا!

ناول نگار' افسانہ نگار' کالم نگار' شاعرہ' مقررہ، سیاستدان' سوشل ورکر اور ساتھ ہی خوش نظر' خوش لباس اور خوش گفتار...... بشریٰ یہ سب کردار' کس طرح بطریق احسن ادا کر لیتی ہے؟ یقیناً رحمٰن صاحب خوش قسمت شوہر ہیں۔

بہت عرصہ ہوا میں نے بشریٰ رحمٰن کا افسانہ پڑھا ''دل اور دفتر''۔ بشریٰ رحمٰن کا یہ پہلا افسانہ تھا، پڑھا اور پسند آیا۔ بشریٰ نے میاں بیوی کے جذباتی تعلقات کی نازک بنیاد پر قلم اُٹھایا تھا اور ژرف بینی کا ثبوت دیتے ہوئے نازک موضوع پہ دلچسپ افسانہ تحریر کرنے میں کامیاب رہی تھی۔ اس افسانہ کے بعد بشریٰ کے ناول بھی پڑھے اور افسانے بھی......اور ہمیشہ فن کے سفر میں ایک قدم آگے بڑھنے کا احساس ہوا۔ تازہ مجموعہ ''چُپ'' اس احساس میں مزید تقویت کا باعث بن رہا ہے۔ تاہم مقامِ شکر ہے کہ جس رفتار سے تقریریں کرتی ہے، اسی رفتار سے افسانے نہیں لکھتی' سوچ سمجھ کر لکھتی ہے......کاتی اور لے بھاگی والی بات نہیں!

کسی بھی تخلیقی فن کار پر اس کے پسندیدہ موضوعات' من بھاتے مسائل اور مخصوص نقطۂ نظر کے حوالے سے لیبل لگانا آسان نہیں ہوتا۔ اس کے لیے تخلیقی عمل کی پرزم میں سے تخلیق سات رنگ کی دھنک

کے رُوپ میں نکلتی ہے۔ اس لیے ہر تخلیق کار کے ہاں وحدت میں کثرت ملتی ہے حتیٰ کہ ان قلم کاروں کی تحریروں میں بھی جن کی لیبلنگ کی جا سکتی ہے' جیسے ترقی پسند تحریک سے وابستہ اہلِ قلم!

اگر بشریٰ رحمٰن کے افسانوی فن کی اساس دریافت کرنا چاہیں تو یہ کارِ دشوار ثابت ہوگا' اس لیے کہ اس نے شعوری طور پر خود کو کسی نظریہ' تصور' یا کلیشے کا پابند نہیں کیا' نہ اسے سیاسی موضوعات سے رغبت ہے نہ علامت نگاری کا شغف' وہ تکنیک میں تجربات کی بھی شائق نہیں' اور نہ ہی اسلوبیاتی دراز دستیوں میں مستور! وہ فضائے تخلیق کی آزاد پکھیرو ہے' جہاں سے بھی دانہ دنکا ملے' چُگ لیتی ہے۔

افسانہ ''چپ'' میں بشریٰ رحمٰن نے لکھا: ''قدرت کی طرف سے اچھا ذہن' اچھی آواز' اچھا قلم اور اچھی تحریر تحفے کے طور پر ملتے ہیں مگر ان تحفوں کی قیمت ساری زندگی چکانا پڑتی ہے۔''

بشریٰ نے یہ بات افسانہ کی غرفہ کے سلسلہ میں لکھی ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ بھی تخلیق کار اور تخلیقی فن کار حاصل کردہ تحفوں کی قیمت عمر بھر چکاتے رہتے ہیں۔ اعصابی کشیدگی' اعصابی تناؤ اور اعصابیت کی صورت میں' نائٹ میئرز کی صورت میں اور کبھی کبھی جان کا نذرانہ دے کر بھی بشریٰ خوش قسمت ہے کہ اسے یہ سب اعصابی پاپڑ نہ بیلنے پڑے اور اس نے مقبولیت حاصل کر لی۔

افسانہ ''کڑیاں اور چڑیاں'' کے چاچا جی کے بقول: ''اِس دُنیا کی ساری خوبصورتی کڑیوں اور چڑیوں ہی سے ہے۔''

دیکھا جائے تو بشریٰ کے بیشتر افسانے بھی کڑیوں ہی کے بارے میں ہیں۔ وہ کڑیاں جو چڑیاں بن کر آزاد فضا میں کھل کر محوِ پرواز ہونا چاہتی ہیں مگر پرواز ہی فضائے محدود کا تلخ احساس کراتی ہے۔ اس لیے کہ یا تو پر قوتِ پرواز گنوا چکے ہوتے ہیں ورنہ پاؤں سے بندھی ڈور بلندی کی ایک حد سے آگے پرواز کی اجازت نہیں دیتی۔ دیکھا جائے تو عورت کی بنیادی کہانی حد اور حدود کے اندر ختم ہو جاتی ہے اور یہ جو طویل طرح طرح کے افسانے ملتے ہیں تو یہ اس مختصر ترین کہانی کے طویل فٹ نوٹس ہیں' لازمی ہوتے ہوئے بھی اضافی!

بشریٰ رحمٰن کے بیشتر افسانوں میں جبلتوں کی آخری حد الانگنے میں جھجک...... خوف...... اندیشہ ٹیبوز مزاحم ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرصتِ گناہ کے باوجود حسرتِ گناہ رہ جاتی ہے' وہی غالب والی بات:

''عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا''

''توفیقِ ذات'' کی تیس سالہ بیوہ تاجور کا یہی مسئلہ ہے۔ جب وہ جسم کے ہاتھوں مجبور ہو کر

جذبات کے دوراہے پر آجاتی ہے تو پھر گھٹنوں کے دو سیاہ نشانات محتسب کا کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ وہی احساس ہے جس نے زلیخا کو اپنے دیوتا کے مجسمہ کو چادر سے ڈھانپنے پر مجبور کر دیا تھا یوں دامنِ یوسف محفوظ ہو گیا۔ تاجور کے اس عمل سے لاتعداد عورتوں کو وہ جذباتی دوراہے یاد آگئے ہوں گے جب اُنھوں نے جذبات کے سیلاب میں ڈوبتے وقت کسی ایسے ہی تنکے کا سہارا لیا ہوگا۔ شوہر، اولاد، سماج، حمل، دوزخ:
مت پوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے!

پروین شاکر نے کہا تھا: ''چار دن کی چاہت میں لڑکیاں نہیں کھلتیں''
لیکن ایسی عورتیں بھی ملتی ہیں جو لمحہ بھر کی چاہت ہی میں بند قفل کی مانند کھل جاتی ہیں یا پھر کسی کتاب کی مانند جذبات کی آندھی سے صفحات پھڑ پھڑانے لگتے ہیں۔ اب یہ ان کے مرد کی نالائقی کہ کھلی کتاب جیسی عورت کے صرف دو صفحات ہی کا مطالعہ کر سکے جیسے ''ملبا'' کا جواد...... اس افسانہ میں بشریٰ نے لکھا ہے:
''بعض مرد ملتے ہی اپنے مدعا کا اشتہار بن جاتے ہیں۔''
لیکن دلچسپ بات یہ کہ بعض عورتیں اشتہار کے دھوکہ میں ناقص پراڈکٹ خرید لیتی ہیں جیسے ''ملبا'' کی عنبرین جو جذبوں کی یلغار سے لرز رہی تھی بلکہ کانپ رہی تھی۔ اور جذبات کے پلِ صراط پر اپنا پاؤں احتیاط سے رکھتی ۔ ۔ اس احساس کے ساتھ کہ: ''میرے کنوارے ارمان مجھے تپتے ہوئے تنور کے کنارے تک ۔ ۔ ۔ ور ''موم آگ کے نزدیک آتی جا رہی تھی'' کہ اچانک ''توفیقِ ذات'' کی تاجور کی مانند عنبرین نے ۔ ۔ ''روایتی عورت'' ''باغی عورت'' کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ رسید کر دیتی ہے...... وہی ہونے نہ ہونے کی ازلی کشمکش!

اگرچہ بشریٰ رحمٰن نے ''ملبا'' کو اس کے منطقی انجام تک پہنچایا ہے مگر ''اصلی تے وڈے'' جذبات کا افسانہ روایتی عورت کے غالب آجانے پر ختم ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ روایتی عورت خود مصنفہ کا بھی مسئلہ ہے۔ بشریٰ کے اندر کی تخلیقی عورت جب افسانہ لکھنے کے لیے قلم اُٹھاتی ہے تو وہ خود کو آزاد محسوس کرتی ہے۔ قلم کے پر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے! وہ جذبات کے بپھرے چناب میں کچے گھڑے پر سوہنی کا ڈوبتا اُبھرنا سر دیکھتی ہے، لیکن لکھنے کے دوران جب دو چار بہت سخت مقامات آتے ہیں، جب دریا، ''آگ کے دریا'' میں تبدیل ہونے لگتا ہے تو وہ اس آگ کو قلم کے لیے روشنائی نہیں بنا پاتی کہ عنبرین کی مانند خود بشریٰ کے اندر بھی روایتی مشرقی عورت ہے خوابیدہ یا بیدار؟

عورت کے لیے جبلتوں کا سفر رگوں میں موجزن لاوے میں کاغذ کی ناؤ میں سفر کے مترادف ہوتا

ہے اسی لیے جذبات کے امتحان میں عورت کو رائیڈر ہیگرڈ کی ''شی'' کی مانند بار بار آتشیں غسل کرنا پڑتا ہے' آگ کے غسل سے اس کا حسن مزید نکھرتا ہے یا وہ کاٹھ کی عورت کی مانند' جل بجھتی ہے' اس کا انحصار اس کے اعصاب کی توانائی پر ہوگا۔

کچی عمر کی لڑکیوں کے لیے محبت ٹھیک رہتی ہے مگر عشق صرف پختہ شخصیت' گہرے ہیجانات اور عظیم جذبات کی حامل عورت ہی کر سکتی ہے۔

بشریٰ رحمن کے افسانوں کی لڑکیاں اسی لیے ناشاد و نامراد رہتی ہیں کہ جذبات کے چناب میں وہ صرف کچے گھڑے پر ہیں حالانکہ عشق کرنے والی عورت کو اپنے لیے کچے گھڑے کی ضرورت نہیں، وہ تو منجدھار میں ڈوبنے والے مرد کے لیے پختہ گھڑے میں تبدیل ہو سکتی ہے۔

آج کی عشق پیشہ عورت کا ایک اور مسئلہ بھی ہے کہ اب اسے اعصابی الجھنوں کے شکار' کمزور شخصیت کے حامل، گرتی دیوار جیسے مرد ملتے ہیں۔ جب عالم یہ ہو کہ: افتادہ تر جو مجھ سے مراد دستگیر ہو...... تو پھر بات کیسے بنے؟

بشریٰ رحمن نے' بنتے بنتے بات بگڑ جانے کے نتیجہ میں جنم لینے والی جذباتی کشمکش کے اندر رہ کے ایسے مرد و زن کو اپنے افسانوں کے کرداروں کے لیے منتخب کیا اور جذباتی تموج کے مرقعے تیار کیے' اسی لیے ''چپ'' کی دنیا کے مرد و زن لاحاصلی سے جنم لینے والے احساسِ زیاں کے بوجھ تلے دبے نظر آتے ہیں۔

بشریٰ رحمن ادب میں نووارد نہیں' وہ افسانہ کے فنی تقاضوں کا ادراک رکھتی ہے اور سادہ اسلوب میں بات کہنے کے ہنر سے واقف ہے۔ اس کی یہی خصوصیت متاثر کرتی ہے کہ بعض خواتین قلم کاروں کی مانند وہ ''اُف اللہ!'' ''ہائے اللہ'' ''اوئی اللہ!'' والا اسلوب اپنانے کے برعکس سیدھے سبھاؤ سے مدعا نگاری کرتی ہے۔

...... آیئے! چپ کا دروازہ کھولیے۔ بشریٰ ماہر گائیڈ کی مانند انگلی پکڑے' واقعات کا مشاہدہ کرا رہی ہے تو طرح طرح کے دلچسپ مرد و زن سے تعارف بھی۔ ان سے ملیے یہ تاجور ہیں اور ان سے ملیے...... ہائیں! مگر بشریٰ کہاں گئی؟ وہ کرداروں کے میلے میں گم ہوگئی ہے۔ کیوں نہ ہو' کہ وہ بھی تو ایک کردار ہی ہے' عظیم افسانہ نگار' خدا کے تخلیق کردہ طویل مختصر افسانہ میں!

ڈاکٹر سلیم اختر

توفیقِ ذات

جب وہ بیوہ ہوئی تو اس کی عمر تیس برس کی تھی اور گود میں پانچ سال کا بیٹا تھا۔ عدت کے بعد سارا خاندان اس کے پیچھے پڑ گیا کہ وہ دوبارہ شادی کر لے۔ اور تو اور سسرال والے بھی باقاعدہ پروپوزل' لے کر آ گئے۔ رشتے میں اس کا دیور لگتا تھا۔ پہلی بیوی کو طلاق دے چکا تھا۔ اس کی ساس چاہتی تھی' وہ اس کے ساتھ شادی کر لے اور اِسی خاندان میں رہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی رشتے آئے۔

امی کہتیں کہ یہ پہاڑ سی زندگی کس طرح گزارو گی۔ اسے بہت حیرت ہوتی۔ اس لیے کہ اچانک صدمے سے اس کے اندر برف کے اتنے تودے گرے تھے کہ پہاڑ اسے بے معنی دکھائی دے رہے تھے۔ بزرگوں کے سارے محاورے اور ڈراوے سن سن کے اسے غصہ آ رہا تھا۔ آخر اسے کچی مٹی کا برتن کیوں سمجھا جا رہا تھا۔ عدت کے بعد اس نے کئی بار اپنے دل کو ٹٹولا۔ کسی خوابیدہ تمنا کی آہٹ نہیں تھی۔ اس نے ایم اے کیا ہوا تھا۔ کسی سے سفارش کروا کے بنک میں جاب حاصل کیا۔ چھ ماہ کی ٹریننگ کے بعد باقاعدہ بنک جانے لگی۔ بیٹے کو سکول میں داخل کرا دیا۔ صبح نو بجے وہ بنک کے ڈیسک پر سر جھکاتی تو شام چار بجے سر اُٹھاتی۔ محنت' شائستگی اور وقت کی پابندی سے اس نے بنک کے اندر ایک مقام بنا لیا تھا۔ سب چھوٹے بڑے ملازم اسے بی بی بلانے لگے تھے۔

بس ایک بات ابا جی نے کہی تھی کہ بیٹا' جوان اور بیوہ عورت کا پاسبان صرف عبادت ہوتی ہے۔ دل نہ بھی چاہے تو اپنی حفاظتی دیوار مضبوط کرنے کے لیے نماز پڑھا کرنا۔ اس نے

تعمیل شروع کر دی۔ جوں جوں اسے نماز کی عادت پڑتی گئی، وہ اللہ سے اپنی ثابت قدمی کی دعا مانگتی رہی۔ رات سوتے میں اسے کلیجے کے اندر ٹھنڈی سی محسوس ہوتی۔ اسے بنک کی طرف سے مکان کا کرایہ ملنے لگا تھا۔ تو ابا امی نے اپنے گھر کی چھت پر اسے ایک انیکسی بنا دی۔ سکول سے آنے کے بعد اس کا بیٹا امی ابا کے پاس ہی رہتا تھا۔ وہ بنک سے سیدھی ان کے پاس آ جاتی۔ رات کا کھانا سب اکٹھے کھاتے۔ اُوپر آ کر وہ بیٹے کو تھوڑا سا ہوم ورک کرواتی۔ اس قدر تھکی ہوئی ہوتی کہ ہوم ورک کرواتے ہی گہری نیند میں اُتر جاتی۔

بنک میں ملازمت کرتے، ترقیاں اور انکری مینٹ حاصل کرتے اسے دس سال ہو گئے تھے۔ اس نے ایک سستی سی موٹر بھی خرید لی تھی۔ اس کے بیٹے نے میٹرک پاس کر لیا تھا۔ وہ اسے کسی اچھے کالج میں پڑھا کر ملک سے باہر بھیجنا چاہتی تھی کہ اچانک اس کی ٹرانسفر اس بنک کی کسی دوسری برانچ میں ہو گئی۔ ٹرانسفر سے پہلے اس کی نیک شہرت وہاں پہنچی۔ اپنی تجربہ کاری اور مستعدی کی وجہ سے وہ نئی برانچ سے بھی مانوس ہو گئی۔

وہاں ایک نئے منیجر صاحب آئے تھے، جن کے سامنے کرسی ڈال کر وہ بیٹھا کرتی تھی۔ کام کرتے کرتے جب بھی وہ سر اُٹھاتی، وہ سامنے نظر آتے۔ کبھی فون کرتے ہوئے۔ کبھی کسی پارٹی کے ساتھ ڈیل کرتے ہوئے۔ کبھی چائے پیتے ہوئے اور کبھی اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے۔ وہ بھی ذرا سا مروّتاً مسکرا دیتی۔ کبھی کسی خاتون کی مدد کے لیے وہ اسے اپنے کیبن میں بلا بھی لیتے۔ کبھی کسی ڈرافٹ یا ہنڈی کے بارے میں اسے اُٹھ کر پوچھنے جانا پڑتا۔

ان دنوں شہر میں ایک صنعتی نمائش لگی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کو نمائش دکھانے کے لیے لے گئی۔ ایک سٹال کے پاس تصدق صاحب بھی اپنے دوست کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ تاجور نے انہیں دیکھا تو بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر فوراً اُدھر لپکی۔ جا کے ماتحتوں والا سلام داغ دیا۔ تصدق صاحب اُس وقت ڈالروں کی بڑھتی ہوئی قیمتوں پر دُھواں دھار اظہارِ خیال کر رہے تھے۔ اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر سلام کا جواب دے دیا اور پھر اپنے دوست کے ساتھ محوِ کلام ہو گئے۔ وہ مؤدّب سی کھڑی رہی۔ تب اُنہوں نے دوبارہ اس کی طرف چونک کر دیکھا بلکہ

سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

تاجور کھسیا گئی۔

شرمندگی سے بولی۔ ''تصدق صاحب! آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں۔ میں ......''

''ہاں ہاں'' ...... اُنہوں نے فقرہ اچک لیا۔ ''بھئی تم تاجور ہو'' ...... پھر قہقہہ لگا کر ہنسے۔ کیا کریں' بنک کے اندر ہر کوئی روبوٹ بنا ہوتا ہے۔ کسی کو غور سے دیکھنے کی مہلت ہی نہیں ملتی۔ معاف کرنا میں نے واقعی تمہیں نہیں پہچانا تھا......''

پھر دوبارہ بولے...... ''تاجور سچی بات ہے' وہاں تم اپنے آپ کو ہر وقت چادر میں لپیٹے رکھتی ہو اور یہاں میں کیسے پہچان لیتا۔ اتنی حسین لگ رہی ہو۔''

''سر'' ...... تاجور نے گھبرا کر اپنے بیٹے کی طرف اشارہ کیا...... ''یہ میرا بیٹا ہے۔''

''ارے ماشاءاللہ ...... لو مجھے یہ بھی نہیں معلوم' میں سمجھتا رہا تم غیر شادی شدہ ہو۔ تم بھی تو اپنا نام تاجور سلطانہ لکھتی ہو۔''

''سر! میرے ہزبینڈ کا انتقال ہو چکا ہے۔''

''اوہو...... اوہو'' ...... پھر وہ تھوڑی دیر اس کے بیٹے سے باتیں کرتے رہے۔ اس کے مشاغل پوچھتے رہے اور جب وہ دوبارہ اپنے دوست کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ وہاں سے کھسک گئی۔ آج وہ اچھی طرح تیار ہو کے آئی تھی۔ اب ہر جگہ اس کا بیٹا اس کے ساتھ جاتا تھا۔ اس لیے وہ اچھا لباس پہننے لگی تھی۔ جوانی میں وہ بہت خوبصورت تھی۔ اسی لیے سارے اسے بار بار دوسری شادی کا مشورہ دے رہے تھے۔ گھر آ کر اس نے سوچا' بیوگی تو جوانی کا کفن ہے۔ اسے اوڑھے زندگی تمام کرنا پڑتی ہے۔ کفن کے اندر کون دیکھتا ہے۔ اگر تصدق صاحب نے اسے غور سے نہیں دیکھا تو کیا گلہ ؟

رفتہ رفتہ اس نے بنک میں تیار ہو کے آنا شروع کر دیا۔ اب چادر اُتار کر کرسی پر رکھ دیتی۔ صرف دوپٹہ اوڑھے کام کرتی رہتی۔ ایک دن اسے محسوس ہوا کہ جسم کے اندر کوئی الاؤ بیدار ہو رہا ہے۔ وہ سارے جذبے جنہیں اس نے تھپک تھپک کر سلا دیا تھا' جاگ رہے ہیں۔

برف کے تودوں کے نیچے آگ جلنے لگی ہے، جس کی تپش سے برف پگھل رہی ہے۔

اس نے پریشان ہو کر اس کا کارن تلاش کرنا شروع کیا۔ یہ جان کر اسے از حد صدمہ ہوا کہ اس کا کارن تصدق صاحب تھے۔ ان کے اندر ضرور کوئی بات تھی۔ ویسے وہ دیکھنے میں بھی بڑے وجیہہ وشکیل تھے۔ ان کی عمر پچپن سال کے لگ بھگ تھی۔ چھریرا بدن تھا۔ بڑی اچھی صحت تھی۔ عام طور پر ولایتی سوٹ اور ٹائی میں دفتر آتے۔ کرسی پر تمکنت سے بیٹھے ہوئے بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ جب بھی کام کرتے کرتے تھک کر نگاہ اُٹھاتی وہ اسے دیکھ کر مسکرا دیتے۔ اس روز نمائش والے واقعے کی تلافی کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتے۔ مسکراہٹ محبت نہیں ہوتی۔ مگر نہ جانے کس طرح ان کی ہلکی ہلکی مسکراہٹوں نے اس کے دل کا زنگ لگا تالہ توڑ دیا۔ وہ لرز اُٹھی۔ اس نے پھر سے چادر اوڑھ لی۔ سامنے دیکھنا بند کر دیا۔ نمازوں میں لمبی لمبی دُعائیں مانگنے لگی۔ لیکن اسے ایسا محسوس ہوتا' اس کے لبوں سے دُعا نکلتے ہی شیطان لپک کر اسے پکڑ لیتا ہے۔ آسمانوں پر جانے ہی نہیں دیتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تصدق صاحب کی تمنا آسیب بن کر اس کے جسم سے لپٹ گئی۔ وہ پریشان ہو اُٹھی اور اِس برانچ سے ٹرانسفر کروانے کی کوشش کرنے لگی۔ اپنے آپ پر نفرین بھیجتی کہ وہ تو کہا کرتی تھی۔ کاٹ لوں گی یہ پہاڑ سی جوانی ......

اب جب دس مشکل ترین سال گزر گئے تھے تو نفس کے پھنیر سانپ نے سر اُٹھایا تھا۔ اسے اپنی پارسائی پر بڑا غرور تھا۔ شاید قدرت اسے اس غرور کی سزا دینے پر تل گئی تھی۔

اس کی ٹرانسفر کے آرڈر جب تصدق صاحب کے پاس پہنچے تو اُنہوں نے اسے اپنے پاس بلایا اور بولے۔

''کیا وجہ ہے تاجور؟ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہاں کسی نے تمہیں تنگ نہیں کیا۔ اور تم نے چھ ماہ بعد ہی ٹرانسفر کروالی...... اور ٹرانسفر کے لیے میرے ایک عزیز دوست کی سفارش تلاش کر لی۔''

تاجور نے سر جھکا لیا۔ کیا کہتی۔

اُنہوں نے سارے ہال پر نظر ڈال کر اپنی آواز آہستہ کر لی اور بولے۔

''کیا کسی کولیگ نے تمہیں تنگ کیا ہے؟''

''نہیں سر''......آہستہ سے کہہ کر تاجور نے سر اور بھی جھکا لیا۔

''اگر ایسی کوئی بات تھی تو تمہیں مجھے بتانا چاہیے تھی۔ اتنی بڑی سفارش لانے کی کیا ضرورت تھی۔''

تاجور باقاعدہ رونے لگی۔

تصدق صاحب کا شک یقین میں بدل گیا۔

''مجھے اندازہ ہے کہ تم ایک پرکشش عورت ہو۔ اپنی کرسی پہ بیٹھی ہوئی بہت اچھی لگتی ہو۔ آنے جانے والے بھی تمہیں دیکھتے ہیں۔ تم ہماری برانچ کا سنگار ہو۔ اگر میں غلطی پر نہیں تو اس برانچ میں بڑے مہذب لوگ ہیں۔ شادی شدہ ہیں۔ ہمدرد ہیں۔ تمہاری عزت کرتے ہیں۔ پھر بھی اگر کسی نے تمہارے بارے میں غلط اندازہ لگایا ہے تو مجھے بتاؤ! میں اتنی آسانی سے تمہاری ٹرانسفر کے کاغذات قبول نہیں کروں گا۔''

تاجور ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

وہ تصدق صاحب کو کیا بتاتی کہ جس قسم کی وہ باتیں کر رہے ہیں اس کے اندر انگارے دہکتے جا رہے ہیں۔ وہ ایسے بول رہے تھے جیسے روٹین کا کام سمجھا رہے ہوں۔ بے اختیار اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ اُن کے گلے سے لپٹ جائے اور اُن کے وجود کی گرم خوشبو اپنی سانسوں میں اُتار لے۔ اپنے اندر اُٹھنے والے شعلوں کی یلغار سے گھبرا کر اس نے آنسوؤں میں نہائی ہوئی آنکھیں اُٹھائیں تو تصدق صاحب شبنم اور شراروں میں گھرا اُس کا چہرہ دیکھ کر مبہوت ہو گئے۔ شاید گونگے جذبے وائرلیس کی انتہا پر پہنچ گئے تھے۔ برقی شعاعوں نے پیغام وصول کر لیے تھے۔ مبہوت بیٹھے ہوئے تصدق صاحب کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے سرخی آئی۔ اس سرخی کی تاجور نے شناخت کر لی تھی کہ یہ ہمیشہ دل سے ہو کر آتی ہے۔

گھبرا کر بولی۔

''سر! آپ مجھے ایک ہفتے کی چھٹی دے دیں۔'' میں سوچ کر آپ کو بتاؤں گی۔

''ٹھیک ہے۔'' تصدق صاحب بھی نئے عرفان سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔

''تم ایک ہفتے کی چھٹی لے لو۔ اس کے بعد آ کر جوائن کرلو''۔ وہ اُٹھنے لگی۔

''اور یاد رکھو میں تمہیں یہاں سے جانے نہیں دوں گا۔''

ساری رات ان کا یہ فقرہ کہ میں تمہیں یہاں سے جانے نہیں دوں گا' اس کے سلگتے ہوئے جسم پر پھول برساتا رہا۔ وہ جس طرف کروٹ بدلتی' اُدھر سے ستارے نکل آتے۔ چاند اس کے رخسار پر جھک آتا۔ کیسی بیقراری تھی جیسے جوانی کی صبح ابھی پھوٹی ہو۔

انجانی خواہشوں کے منہ پر ہاتھ رکھتے رکھتے وہ تھک گئی تو اسے واقعی بخار ہو گیا۔

جب دو ہفتے تک بنک نہ گئی تو تصدق صاحب گھر پر اس کی خبر لینے آ گئے۔ شکر ہے اس وقت وہ ڈاکٹر کے پاس گئی ہوئی تھی۔

وہ کافی دیر امی ابا کے پاس بیٹھے رہے اور اُن سے کہہ دیا کہ اس کی ٹرانسفر کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ یہی نہیں بلکہ اُنہوں نے بنک میں بھی بڑے سلیقے طریقے سے سارے لوگوں کو سمجھا دیا کہ اس کا خاص خیال رکھیں۔

ایک ماہ بعد وہ تندرست ہو کر بنک میں آ گئی۔ اب اسے پہلی سی الجھن نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ اس نے تصدق صاحب کی آنکھوں میں ایک چیز دیکھ لی تھی۔ جب مرد کے دل میں چاہ پیدا ہوتی ہے تو اس کی آنکھ کی پتلی میں ایک نشہ آور روشنی آ جاتی ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ اس روشنی کا بلب صرف اس وقت جلتا ہے جب وہ اپنی محبوب ہستی کی طرف دیکھتا ہے۔ اس کے سوا کسی دیکھنے والے کو کبھی پتہ نہیں چلتا کہ دیا کہاں جل رہا ہے اور لو کہاں تھرتھرا رہی ہے۔

تصدق صاحب نے باقاعدہ گھر آنا جانا شروع کر دیا۔ ابا کو ان کی طبیعت بہت پسند آئی۔ پتہ نہیں معاملات میں کھڑکی کب کھل جاتی ہے۔ کیونکہ اب بہت سی باتیں سونے سے پہلے بیڈ روم کے فون پر ہو جاتی تھیں۔ انہی دنوں تصدق صاحب کے بیٹے کی شادی ٹھہر گئی۔ انہوں نے سارے بنک کو مدعو کیا۔ تاجور بطور خاص ہر تقریب میں خوب بن سنور کر جاتی رہی۔ اس نے اپنے اندر بڑا انقلاب محسوس کیا کہ جب بھی وہ ان کے گھر جاتی' ہمہ وقت اس خواہش

میں مبتلا رہتی کہ تصدق صاحب آتے جاتے ہوئے اسے ایک نظر دیکھ لیں۔ ہر زاویے سے وہاں جا کر بیٹھتی جہاں سے ان کے گزرنے کا امکان ہو اور جب وہ اسے نظر آ جاتے تو اس کے وجدان میں بھونچال آ جاتا۔ جیسے اندھیرے کمرے میں اَن گنت جگنو چمک اُٹھے ہوں۔ وہ اسے اسی مخصوص مست نظر سے دیکھتے۔ مسکراتے اور گزر جاتے...... ذرا سی مسکراہٹ دھڑکن کی جوت جگا جاتی۔

تصدق صاحب کی بیگم بہت سمارٹ اور تعلیم یافتہ عورت تھی۔ کبھی کبھی تاجور کا ضمیر تازیانے برساتا کہ وہ کسی ہنستی بستی عورت کے بیڈرُوم میں نقب لگانا چاہتی ہے۔ نمازیں وہ اب بھی پڑھتی تھی۔ مگر اب اسے یوں محسوس ہوتا کہ مصلےٰ برابر اس کی ہنسی اُڑا رہا ہے اور صاف کہتا ہے۔ ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں......

پھر وہ رات سونے سے پہلے دلائل کی فوجیں لے آتی۔ میں بھری جوانی میں بیوہ ہوئی میرا کیا قصور تھا...... دوبارہ شادی نہیں کی تو محض اپنے بیٹے کی خاطر...... بڑی بڑی سیانی باتیں کرنے والا کوئی مرد اپنی سوتیلی اولاد کو قبول نہیں کرتا۔ اب زین سولہ سال کا تھا۔ اب وہ سنبھل گیا تھا۔

پھر کب تک وہ اپنی منہ زور جبلتوں کو لگام دیتی۔ اصل میں اس کے خیالات بدلنے میں اس کی ایک سہیلی نے بڑا رول ادا کیا تھا۔ شاہینہ شاہد کا اُس کے پاس اکاؤنٹ تھا۔ وہ اسلام آباد کے ایک سرکاری دفتر میں ملازمت کرتی تھی۔ جب دوستی ہوئی تو اسے بتانے لگی کہ اس نے جان بوجھ کر لاہور میں اکاؤنٹ کھول رکھا ہے۔ یہاں وہ اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ کچھ وقت گزارنے آتی ہے۔

"لیکن تمہارا تو شوہر ہے۔ دو بچیاں بھی ہیں!"

"یہ شوہر کیا نہیں کرتے باہر کی دُنیا میں...... میرے شوہر کے کئی عورتوں سے مراسم ہیں۔ میں نے بھی دُنیا میں ایک ہی بار آنا ہے۔ میں کیوں نہ انجوائے کروں......اور بیٹیوں کا کیا ہے۔ جوان ہو جائیں گی تو وہ بھی اپنے پارٹنر تلاش کر لیں گی۔"

''شاہینہ مگر یہ تو گناہ ہے۔ صریحاً گناہ!''

وہ حیران ہو کر کہتی۔

''پگلی، توبہ تو اسی لیے بنائی گئی کہ پہلے تم گناہ کرو۔ پھر توبہ کرو۔ کچھ کیے بغیر بخشش کی تمنا کرنا حماقت نہیں تو کیا ہے۔''

رفتہ رفتہ شاہینہ کی باتیں اس کی سمجھ میں آنے لگیں۔ اس کا بھی دل چاہنے لگا کہ وہ ایک گناہ کرے اور پھر زندگی بھر توبہ کرتی رہے۔''

وہ بھی سوچنے لگی، دُنیا میں بار بار نہیں آنا۔ جوانی نے دُور تک نہیں جانا۔ پیاس نے ہمیشہ نہیں بھڑکنا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ گئے وقتوں میں اس نے بھوسے کے اندر دہکتا ہوا کوئلہ دبا دیا تھا۔ دھواں تو نکلنا ہی تھا۔ شعلہ تو بننا ہی تھا۔

اس روز اتفاق سے امی ابا سیالکوٹ چلے گئے۔ زین کے امتحان ہو چکے تھے۔ وہ بھی ضد کر کے ان کے ساتھ چلا گیا۔ پتہ نہیں کیوں اس کا دل کئی دنوں سے چور دَروازے تلاش کر رہا تھا۔ دروازہ بنتے ہی اس نے تصدق صاحب کو فون کر دیا۔ وہ تو نہال ہو گئے۔

طے یہ ہوا کہ اتوار کا سارا دِن وہ اس کے ساتھ گزاریں گے۔

ساتھ گزارنے کا مطلب وہ سمجھ گئی تھی...... ہنس کر کہہ رہے تھے۔ ''بس کل ہم تمہارے مہمانِ خصوصی ہوں گے اور تم ہمارے ساتھ ''سلوکِ خاص'' کرو گی۔''

اس کا دل پگھلنے لگا۔

اُنہوں نے پوچھا...... ''کھانا کھلاؤ گی؟''

بولی۔ ''خود پکاؤں گی۔''

''اور تواضع بھی......''

''جی......''

علی الصبح اس نے اُٹھ کر پہلے اپنے فلیٹ کو چمکایا۔ کیونکہ اتوار کو تو جمعدارنی بھی نہیں آتی تھی۔ جلدی سے بازار گئی۔ سودا لائی ...... خاص طور سے سرخ گلابی پھول لائی ...... بیڈ رُوم اور

ڈرائنگ رُوم میں پھول سجائے۔ کھانا تیار کیا۔ میز پر برتن سجائے۔ اپنا خوبصورت سوٹ نکال کر استری کیا۔ فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے فون اُٹھایا وہ بہت سرگوشی میں بولے کہ "ٹھیک ایک بجے پہنچوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" اُس نے آہستہ سے کہا۔

نظر اُٹھا کر دیکھا' گھڑی پر بارہ بج رہے تھے۔ اسے تیار ہونے کا وقت مل گیا۔ آج وہ خاص انداز سے تیار ہونا چاہتی تھی۔ عورت اِس معاملے میں زیرک ہوتی ہے۔ مرد اس معاملے میں پیادہ ہوتا ہے۔ وہ پیادے کو مات دینے والا مہرہ پہلے تیار رکھتی ہے۔

سارے کمروں میں ایئر فریشنر چھڑک کے' ہلکی ہلکی موسیقی لگا کے وہ نہانے کے لیے غسل خانے میں چلی گئی۔ لاتعداد پھلجھڑیوں جیسے خیال اس کے ساتھ ہی اندر چلے گئے۔ شاور کے نیچے نہاتے ہوئے وہ باقاعدہ گنگنا رہی تھی۔ گنگنا گنگنا کر اپنے آپ کو گدگدا رہی تھی...... شاور کی پھوار کو گیت کی دُھن میں ملا کر ایک نیا ردھم پیدا کر رہی تھی۔ جب اچانک خوشبودار صابن لگاتے ہوئے اس کی نظر اپنے گھٹنوں پر چلی گئی...... جیسے اسے کرنٹ لگا اور صابن اس کے ہاتھ سے پھسل کر دُور جا گرا۔

تھوڑی دیر کے لیے وہ سہم کر ٹب میں بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھ لیے......

کتنی دیر تک گم صم بیٹھی رہی!

کتنی صدیاں اس کے آگے پیچھے سے گزر گئیں!

پہلے وہ ان دو سیاہ نشانوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا کرتی تھی اور سوچا کرتی تھی' یہی سیاہ نشان اس کی گواہی دیں گے۔

آج یہ دو سیاہ نشان محتسب بنے اس کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ ان سے آنکھ بچا کے نکل جانا چاہتی تھی۔ ان کو کھرچ دینا چاہتی تھی۔ ان کو نوچ دینا چاہتی تھی۔ اِن کو یکسر نظر انداز کر کے بھاگ جانا چاہتی تھی......

سراسیمگی میں نہائی۔ کپڑے بدلے سنگار کیا مگر وہ سیاہ نشان آئینے کے اندر سے جھانکنے

لگے۔ پھولوں کو ٹھیک کرنے لگی وہاں سے اُبھر آئے۔ کچن میں گئی تو ہر دیگچی پر بیٹھے تھے۔ کھانے کی میز لگانے گئی تو ہر پلیٹ میں ایک سیاہ دائرہ تھا۔

بیل ہوئی۔ تصدق صاحب آ گئے۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ کتنے خوبصورت لگ رہے تھے۔ لٹھے کی سفید شلوار کے اُوپر بوسکی کی قمیض جس کے کف کھلے تھے۔ گریبان کے بھی دو بٹن کھلے تھے۔ خوشبوؤں کی پھوار میں نہا کر آئے تھے۔ اُن کو بھی معلوم تھا' آج کس طرح سنور کر جانا ہے۔ اُنہوں نے ہاتھوں میں بہت سارے پھول اُٹھائے ہوئے تھے۔

''آج آپ سارے شہر کے پھول اکٹھے کر لائے!'' تاجور نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''چاہتا یہی تھا کہ سارے شہر کے پھول تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دوں...... اسی لیے کچھ تاخیر بھی ہوئی۔''

تاجور نے پھول پکڑ لیے اور میز پر رکھ دیئے۔

وہ آ کر ڈرائنگ رُوم میں بیٹھ گئے۔ ہلکا میوزک بج رہا تھا۔ کمرے کی ساری فضا رومانوی ہو رہی تھی۔ صوفے پر بیٹھتے ہی اُنہوں نے تاجور کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنے پاس بٹھالیا۔ اور جب اس کی طرف جھکے تو وہ ہاتھ چھڑا کر جھٹکے سے اُٹھی اور بھاگ کر غسل خانے میں چلی گئی۔ اندر جاتے ہی چٹخنی چڑھالی اور چیخ چیخ کر رونے لگی۔ اتنے زور سے روئی کہ اس کی آواز باہر تصدق صاحب کو بھی آنے لگی۔

تصدق صاحب اس قدر حیران ہوئے' جس قدر ہو سکتے تھے۔ ساری سجاوٹ' ساری خوشبوئیں' تنہائی' اہتمام...... یہ تو کچھ اور سماں پیدا کر رہا تھا۔

اور تاجور کی یہ ادا......

تھوڑی دیر حیران و ساکت بیٹھے رہے۔ پھر اُٹھ کر اُنہوں نے غسل خانے کا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا اور کہا ''تاجور باہر آؤ اور آ کر مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے۔''

اندر سے رونے کی آواز آتی رہی......

اُنہوں نے پھر کہا ''پلیز باہر آ جاؤ تمہاری مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہو گا۔''

سسکیاں معدوم ہو گئیں۔ مگر نہ دروازہ کھلا' نہ تاجور باہر آئی۔

وہ جھلا کر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگے......

کمال ہے۔ خود ہی بلایا' خود ہی اتنا اہتمام کیا' اور اب......

تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ ناک کرتے رہے۔

آخر انہوں نے تنگ آ کر کہا۔ ''تاجور باہر آ جاؤ۔ میں تین منٹ انتظار کروں گا اور پھر چلا جاؤں گا۔''

تین منٹ۔

تین منٹ......

تاجور فرش پر اپنے گھٹنوں کو پکڑ کر بیٹھی تھی۔ اور تین منٹ تین صدیاں بن کر گزر رہے تھے' جنہوں نے خوابوں اور حسرتوں کا لاتعداد سامان ساتھ لے کر جانا تھا۔

تصدق صاحب جب سیڑھیاں اُتر رہے تھے' دو بج رہے تھے۔ کھانے کی میز پر سجے ہوئے برتن ان کی ہنسی اُڑا رہے تھے۔

سارے پھول حیرت سے اُنہیں دیکھ رہے تھے......

اور سلیم شاہی جوتا گویا اُن کے منہ پر لگ رہا تھا!

جب اسے تسلی ہو گئی کہ تصدق صاحب جا چکے ہیں تو اس نے غسل خانے کی چٹخنی کھولی۔ باہر جھانک کر دیکھا۔ پہلے سیڑھیوں والا دروازہ لاک کیا۔ کپڑے بدلے اور سکون آور گولی کھا کر سو گئی۔

بنک کی اس برانچ سے ٹرانسفر کروائے اُسے پانچ سال ہو گئے۔ اس کا بیٹا مزید تعلیم کے لیے امریکہ جا چکا تھا۔ ابا کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ امی کے ساتھ رہنے لگی تھی۔

☆☆☆

ایک دن اس کی ایک سہیلی نے آ کر بتایا کہ عراق سے ایک بزرگ شہر میں آئے ہوئے ہیں۔ لوگ دھڑا دھڑ ملنے جا رہے ہیں۔ کیا نورانی چہرہ ہے' اور کیا بات کرنے کا انداز ہے!

وہ بولی۔ ''یہ پیر فقیر سب فراڈ ہوتے ہیں۔ میں کیا کروں گی جا کر۔''

''بھلا انہیں سن لینے میں کیا ہرج ہے۔ ایسی باتیں کرتے ہیں کہ ہر دل کو اپنا جواب مل جاتا ہے۔''

''میں نہیں مانتی۔'' تاجور بولی۔

اس کا دل پانچ سال سے پچھتاووں کی آگ میں جل رہا تھا۔ وہ بقیہ زندگی اپنے آپ پر ملامت کرنے میں گزارنا چاہتی تھی۔

اس نے نوکری مانگی' اسے نوکری مل گئی۔ اس نے مہنگے سکول میں بچے کا داخلہ مانگا' اسے داخلہ مل گیا۔ اس نے موٹر مانگی' اسے موٹر مل گئی۔ اس نے گھر مانگا' اسے گھر مل گیا۔ اس کی اللہ سے یاری ہو گئی۔

یاری میں بددیانتی تاجور نے کی تھی......

وہ جب اپنی سہیلی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی' شیخ فرما رہے تھے۔ ''کبیرہ گناہ وہ گناہ ہے جس کا ارتکاب ایسی حالت میں کیا جائے جب انسان کا دل اللہ' اس کے فرشتوں' کتابوں' رسولوں اور یوم آخرت سے بے تعلق ہو چکا ہو۔ خواہ وہ ظاہری طور پر اس تعلق کا داعی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ یہ بظاہر تعلق کچھ مفید نہیں ہو سکتا۔ ایسی حالت میں گناہ اس لیے کبیرہ بن جاتا ہے کہ بندہ بے تعلقی کی کیفیت میں دل' جسم' ہاتھ' پاؤں اور تمام اعضا سے گناہ میں پڑ جاتا ہے۔ نہ دل اسے اس کام سے منع کرتا ہے اور نہ کوئی اور بات اسے اس وقت ربّ کی یاد دلاتی ہے۔ اور صغیرہ گناہ وہ گناہ ہوتا ہے جسے بندہ ایسی حالت میں کرے جبکہ اس کا تعلق اللہ سے اور اُن وسائل سے ہو جو اللہ تک پہنچا دیتے ہیں۔ کیونکہ ایسی حالت میں بندہ جب گناہ کرتا ہے تو بغیر ارادے کے کرتا ہے اور اس گناہ کے ساتھ اسے ایک خاص قسم کا قلق اور بغض ہوگا۔ اس کا دل اسے اسی وقت ملامت کرتا ہے تو اپنے ربّ کی شرم و حیا اُس کے وجود میں سما جاتی ہے۔''

تاجور کی چیخیں نکل گئیں......

ساری محفل نے مڑ کر اُسے دیکھا۔ وہ سفید چادر اوڑھے جوتوں کے قریب بیٹھی تھی۔

پھر ایک مرد نے آگے بڑھ کر سوال کر دیا۔ ''یا شیخ! ذکر کی محفل میں لوگ چیختے کیوں ہیں۔ بے قابو کیوں ہو جاتے ہیں؟''

شیخ نے مجمعے پر نظر ڈالی۔ زیرِ لب مسکرائے۔ پھر گویا ہوئے۔ ''ہر انسان کے ساتھ اس کی اپنی رُوح کا نور ہوتا ہے۔ کبھی کبھی یہ رُوح اپنا نور ذاتِ انسانی پر ڈالتی ہے۔ جس کی وجہ سے ذات مضطرب ہو جاتی ہے۔ جب کبھی انسان اپنے ربّ کی نافرمانی کا تجربہ کرتا ہے اور نفس کی خواہش پر سرنگوں ہوتا ہے تو یہی نور اِس پر خشوع و خضوع طاری کر دیتا ہے۔ ذات کی یہ روشنی اس کا رجوع اللہ کی طرف کر دیتی ہے۔ طاعت اور بے بسی کا ایک لمحہ اسے ایسی کیفیت میں لے جاتا ہے، جہاں وہ یک بیک چیخ اُٹھتا ہے۔ وجد میں آجاتا ہے۔ یا دھمال ڈالنے لگتا ہے۔ یہ کیفیت صرف۔ ان لوگوں کو پیش آتی ہے جن کے لیے اللہ بھلائی چاہتا ہے۔ اس لیے کہ یہ ہدایت کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔ اس کیفیت کو اپنی عبادت کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیے۔ ورنہ خودستائی انہیں ظلمت کی طرف لے جاتی ہے۔''

تاجور پر گریہ کی کیفیت طاری تھی۔ وہ ابھی تک ہچکولے لے لے کر رو رہی تھی۔ آنسو رکتے ہی نہ تھے۔

ایک صاحب نے پھر سوال کیا۔ ''یا شیخ! کیا یہ دکھاوے کی چیز ہے؟''

شیخ نے فرمایا۔ ''دکھاوے کی نہیں ہے۔ غیر متوقع اور غیر ارادی طور پر طاری ہوتی ہے۔ بشرطیکہ ان لمحوں کو شیطان نہ چرا لے۔''

''حضرت! کیا ہر ذات کو رُوشنی کی توفیق ملتی ہے۔'' ایک عورت نے پوچھا۔

شیخ فرمانے لگے۔ ''ہر ذات کی اپنی رُوشنی ہوتی ہے، جس میں وہ چلتی ہے۔ چنانچہ اگر اس کی رُوشنی اسے صحیح راستہ پر لے جائے تو یہ توفیق یافتہ ذات ہے۔ اور اگر اس کی رُوشنی اسے کج رو بنا دیتی ہے تو اِسی کو ہم ظلمت کہتے ہیں۔ گویا توفیقِ الٰہی نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔''

کوئی اور سوال کرنا چاہتا تھا۔ شیخ نے ہاتھ سے روک دیا۔

مجمع پر نگاہ ڈال کر بولے۔ ''تاجور سلطانہ کون ہے؟''

روتی روتی تاجور نے چہرہ اُٹھا کر اُن کی طرف دیکھا اور کھڑی ہو گئی۔

بولے......

''قریب آؤ بیٹی!''

وہ اُن کے قریب آ کے دوزانو بیٹھ گئی۔ اُن کے قرب میں کوئی آنچ تھی۔ تاجور کا قلب اور آنکھیں ایک ساتھ جاری ہوئے۔

شیخ نے اپنے کاندھے پر رکھے ہوئے دوشالے کا پلو اِس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس نے تھام لیا۔ پھر اس کے ہلتے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور آہستہ آہستہ بولے......''ہمیں تمہارے لیے یہاں بھیجا گیا ہے!''

☆☆☆

مقامِ دل نہیں آیا؟

میں دس دس منزلہ شاپنگ پلازا کی ساتویں منزل پہ کھڑا دُنیا کو دیکھ رہا ہوں' یہ سامنے والی سڑک' جو اَب اس شہر کی مصروف ترین اَور کشادہ سڑک ہے' پہلے یہاں نہیں تھی۔ یہاں ایک جدید شاپنگ سنٹر' بے شمار ریستوران' خوبصورت فلیٹ' راتوں کو جگمگانے والے قمقمے بھی نہیں تھے۔ کھڑکی میں کھڑا میں وقت کے اُس پار دیکھتا ہوں۔ بیس سال پہلے ہی کی تو بات ہے' یہ ساری کچی سڑک تھی۔ اس [illegible] سے اِکا دُکا موٹر اور ٹرک دھواں چھوڑتے گزر جاتے تھے۔ البتہ گدھا گاڑیاں' اِکے ا[illegible]ں بہت گزرا کرتی تھیں۔ مزدوروں کی ٹولیاں بھی علی الصبح رومالوں میں روٹیاں باندھے [illegible] اسٹاپ کی طرف جاتی نظر آتی تھیں۔ اِردگرد جہاں روشنیاں ہی روشنیاں ہیں' کبھی جھگیاں ہی جھگیاں تھیں۔ ان ہی جھگیوں کے درمیان ایک پکا مکان تھا جس میں ایک چودھری صاحب رہتے تھے' جو عیال دار تھے اور کسی دُور دراز کے گاؤں میں چھوٹی سی زمیں داری کرتے تھے۔

انتخابات کے ایک موسم میں چودھری صاحب اچانک جھگیوں اور کچے گھروندوں کے آگے لٹکنے والی پیوند لگی بوریاں اور ٹاٹ اُٹھا اُٹھا کر اندھیرے گھروں میں جھانکنے لگے۔ روشنی کی ایک درز کے عوض وہ منتخب ہو کر اسمبلی میں آ گئے۔ اس روز اَدھ ننگے جھگی والوں نے ڈھول کی تھاپ پر والہانہ رقص کیے اور چوہدری صاحب کو کاندھوں پر اُٹھا کر ان کے گھر تک لے گئے۔ اس کے بعد چودھری صاحب اس بستی کے دولہا بن گئے۔ اُنہوں نے بسیار کوشش کے بعد حکومت سے یہ کچی بستی منظور کروائی۔ پھر اس میں پکی سڑکیں بنوائیں۔ پانی' بجلی' سیوریج سب

سہولتیں مہیا کرائیں۔ بہت سے غریبوں کو چپڑاسیوں' ڈرائیوروں اور کلرکوں کی نوکریاں دلوائیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ کچے گھروندوں کے بے تاج بادشاہ اور جھگی والوں کے دردآشنا بن گئے۔ انتخابات کا دوسرا موسم آیا تو خود جھگی والوں نے انہیں کھڑا کر کے دن رات ان کی انتخابی مہم چلائی۔ انہوں نے انتخابی نشان بھی ''مٹی کا دیا'' مانگا۔

انجام کار نہ صرف یہ کہ وہ بھاری اکثریت سے جیت گئے بلکہ اب ان کی موٹر پر جھنڈا بھی لگ گیا۔ یعنی وہ وزیر بن گئے۔ دوسرے انتخابات میں' مَیں چودھری صاحب کا دستِ راست اور سرگرم کارکن تھا۔ اس لیے وزیر بنتے ہی انہوں نے مجھے اپنا پولٹیکل سکریٹری بنالیا۔ گو میری تعلیم تو صرف میٹرک تک ہے لیکن مسلسل پبلک ڈیلنگ سے میرے اندر ایک شاطرانہ سا شعور آپ ہی آپ بیدار ہو گیا تھا۔

ایک دن چودھری صاحب نے مجھے بلایا اور وہ پلان جو اُن کے ذہن میں کئی برس سے پک رہا تھا مجھے سونپ دیا۔ اگر چہ یہ کام انتہائی مشکل تھا مگر وہ پولٹیکل سکریٹری ہی کیا جو اَپنے لیڈر کی مشکلات حل نہ کر سکے اَور پھر مجھے بھی تو اسی میں اپنا تابناک مستقبل نظر آرہا تھا۔ چنانچہ میں نے شہر سے دُور ایک خطۂ زمین تلاش کیا' اسے اونے پونے خریدا اَور چودھری صاحب کے گھر کے آس پاس رہنے والے سینکڑوں جھگی والوں کو قائل اور مائل کر کے یہاں سے منتقل کرنا شروع کر دیا۔ پیسہ میرے پاس وافر تھا۔ زمین مَیں مفت دے رہا تھا اور مکان بنانے کے لیے قرضِ حسنہ بھی دے رہا تھا۔ کچھ لوگوں نے چلے جانے میں عافیت جانی۔ کچھ لوگوں نے احتجاج کیا۔ کچھ نے ہڑتال کی دھمکی دی۔ مگر ان باتوں کو جمہوریت کا لازمہ سمجھ کر دھیان دینے کے قابل نہیں گردانا جاتا۔ جنہوں نے براہِ راست چودھری صاحب تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی وہ بھی نامراد رہے کہ جب سے چودھری صاحب کی کار کو جھنڈا لگا تھا' وہ زمین پر نظر نہیں آتے تھے۔ یوں یہ کیڑے مکوڑوں کی طرح ووٹ ڈالنے والے اِنسان دھمکائے گئے' اُجاڑے گئے' بھجوائے گئے۔ بالآخر نئی بستی کی یہ ساری زمین چودھری صاحب کے نام منتقل ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہاں چودھری صاحب کا فلک بوس محل بننا شروع ہو گیا۔ جس کی چھوٹی

چھوٹی برجیاں اور بڑی بڑی فصیلیں تھیں۔ باہر نیزے جیسی سلاخوں والا ایک پھاٹک تھا جس کے حجرے نما کمرے میں ایک بندوق بردار کھڑا نظر آنے لگا۔

اس کے ساتھ ہی یہ پورا علاقہ جدید طرز کی کالونی کے ڈیزائن پر ڈیولپ ہونا شروع ہو گیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ شہر کا ایک خوب صورت منظر بن گیا۔ میرے حصے میں یہ دس منزلہ پلازہ آیا ہے۔ نچلے حصہ میں ڈیپارٹمنٹل اسٹور اور دکانیں ہیں اور اُوپر رہائشی فلیٹ ہیں۔ ان میں سے ایک آرام دہ ڈیلکس فلیٹ میں مَیں خود رہتا ہوں۔ نیچے میرا ایک شورُوم ہے۔ پراپرٹی ڈیلنگ اور کار ڈیلنگ کا کاروبار بھی شروع کر رکھا ہے۔ غیر ملکی دورے بھی کر چکا ہوں۔ اپنے چودھری صاحب کی پرواز پھر اُوپر ہی اُوپر رہی۔ ان کے گھر کی چکا چوند میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔

کسی زمانے میں چودھری صاحب اس بات پر پریشان رہا کرتے تھے کہ بیٹے کی آس میں انہوں نے چھ بیٹیاں پیدا کر لیں۔ اگر چہ اِن کے دو بیٹے بھی ہوئے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ یہی بیٹیاں ان کی خوش نصیبی کی علامت بن جائیں گی۔ کیوں کہ ان ہی بیٹیوں کی شادیاں انہوں نے ایک سے ایک بڑے سیاسی گھرانے میں کرنی شروع کر دیں، تو لمبی لمبی موٹروں اور قد آور شخصیات کا ان کے گھر میں مستقل آنا جانا ہو گیا۔ ہمارا پورا علاقہ چودھری غلام نبی کے نام پر ''نبی نگر'' کہلایا اور چودھری کے حوالے سے ہی لوگوں کے پتے شناخت ہونے لگے۔

یہ ارتقا ہے!......

میں ساتویں منزل والے اپنے فلیٹ کی کھڑکی میں کھڑا سامنے سڑک پر رُکے ہوئے ٹریفک اور موٹروں کی لمبی قطاریں دیکھ رہا ہوں۔ جیسے مویشیوں میں مویشی منہ دیئے کھڑے ہوں۔ ہر ماڈل اور ہر سائز کی کار اِس سڑک پر کھڑی ہے۔ ابھی یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا ملک غریب ہے۔ جب اشارہ کھلے گا تو گل دستے کی طرح یہ موٹریں بکھرنا شروع ہوں گی۔ اس زمین کا منظر کیسے اور کس طرح تبدیل ہوا......؟

جو کچھ چودھری صاحب نے کیا وہ بھی ارتقا ہے۔ اپنے خاندان کو کہاں سے کہاں لے گئے۔ مجھ ایسے فاقہ مست کو بھی دنیاوی آسائشوں کا رسیا بنا دیا۔ دُنیا کا یہی نظام ہے شاید۔

سب اُوپر تلے ہوتا رہتا ہے ورنہ آدمی کے اختیار میں ہوتا تو شاید ہر آدمی' ساری دُنیا اپنے ہی نام لکھوا لیتا!

آج کل چودھری صاحب بیڈ ریسٹ میں ہیں۔ ان کے آدھے جسم پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔ علاج معالجہ کے لیے بیرونِ ملک گئے تھے۔ پیسہ یہاں بھی پانی کی طرح بہہ رہا ہے۔ اسی جسم و جاں نے قوتِ پرواز عطا کی تھی' یہی جسم و جاں اپنی قیمت وصول کر رہے ہیں۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے چودھری صاحب کا بیٹا چودھری اکمل میرے پاس آیا تھا۔ بڑے ادب سے سلام کیا' تپاک سے ملا' سعادت مندی سے سر جھکا کر باتیں کرتا رہا۔

''اباجی کا خیال ہے کہ اس مرتبہ مَیں انتخابات میں حصہ لوں۔ یہ ہماری خاندانی سیٹ ہے۔ آپ تو جانتے ہیں' اباجی مستقل بیمار رہتے ہیں اور میں اس قابل ہو گیا ہوں کہ ان کی گدی سنبھال لوں۔''

''بڑی خوشی کی بات ہے۔'' میں نے کہا۔ تمہارے باپ نے بڑی محنت کی ہے تو اسی لیے......''

''آپ کو معلوم ہے ہمارا خاندان سیاسی ہے۔ اس سیاست کو آگے نہ بڑھایا تو ہماری خاندانی سیٹ چھن جائے گی۔ اباجی بڑے بھیا کو سمجھاتے رہے ہیں۔ مگر وہ کہتے ہیں ''میں اتنا بڑا کاروبار سنبھالتا ہوں۔ اسے سیاست کی نذر کیسے کر دوں؟'' سو مجھے اباجی کی خواہش کا احترام کرنا پڑا ہے۔ اس ملک میں سیاست کے بغیر کاروبار بھی تو پروان نہیں چڑھ سکتا۔ آخر اِدھر بھی تو دیکھنا پڑتا ہے۔''

''سیاسی خاندان......؟'' میں اس کی صورت دیکھنے لگا اور سوچنے لگا کہ واقعی سیاسی خاندان تو کوٹھیوں' کاروں اور کارخانوں سے ہی بنتے ہیں۔ یہ چیزیں نہ ہوں تو سیاست میں آنا پڑتا ہے۔ پھر ان سب چیزوں کو قائم رکھنے کے لیے سیاست میں رہنا پڑتا ہے۔ بڑے چودھری صاحب نے قوم کی کوئی خدمت کی ہو یا نہ کی ہو' اس کچی آبادی کو ''پوش'' علاقہ ضرور بنا دیا اور کارخانے لگا کر بہت سے غریبوں کو روزگار بھی فراہم کیا اور مجھے تو سیٹھ عبدالقیوم بنا دیا ہے۔

''چاچا جی!'' چودھری اکمل بولا۔ ''مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔'' ایسے موقعوں پر چودھری کے بیٹے مجھے ہمیشہ ''چاچاجی'' کہتے ہیں۔

''بیٹا' میں تو خود بوڑھا ہو گیا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''مجھ میں اتنی سکت کہاں؟ تمہارے باپ کو اتنے الیکشن لڑائے ہیں کہ اب تھک گیا ہوں۔ میں کوئی اعتماد والا آدمی تمہارے حوالے کر دوں گا۔''

''نہیں چاچا جی۔'' وہ اصرار کرنے لگا۔ ''آپ کب بوڑھے ہوئے ہیں؟ آپ تو ابا جی سے چھوٹے ہیں اور دیکھنے میں تگڑے جوان نظر آتے ہیں۔ میں کچھ نہیں سنوں گا۔ یہ میرا پہلا الیکشن ہوگا اور ابا جی کی طرح آپ کو مجھے بھی جتوانا ہوگا۔''

کافی بحث کے بعد مَیں ہار گیا' رقم بھی وہ کافی دے رہا تھا۔ طے یہ پایا کہ میں جلسے' جلوسوں والی بھاگ دوڑ تو نہیں کر سکوں گا مگر حکمتِ عملی بنانا اور اشتہار بازی کرنا میرا کام ہوگا۔

وہ خوش ہو کر چلا گیا۔

میں اپنا پائپ اٹھا کر یہاں کھڑا ہو گیا ہوں۔ ساتویں منزل کی کھڑکی سے دُنیا کتنی متحرک اور دل کش نظر آ رہی ہے۔ کیا یہ ارتقا کی سزا ہے کہ آپ کو سکون سے رہنے کی اجازت نہ ہو؟ سب کچھ رواں دواں ہے۔ کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے' ہوتا رہنا چاہیے۔ یہی دُنیا کا چلن ہے۔ ہم نہ بھی ہوں گے تو کچھ نہ کچھ ہوتا رہے گا۔ کچھ آباد ہوگا تو کچھ برباد بھی ہوگا۔ آبادی اور بربادی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

چودھری کے بیٹے' چودھری کے سیاسی جانشین بننے کی اہلیت سے محروم ہیں۔ مگر سیاست میں اہلیت کون دیکھتا ہے؟ یہ بھی وراثت کی طرح نسل در نسل چلتی رہتی ہے۔ چودھری اکمل اگر جیت بھی گیا تو بہت آگے نہیں جا سکے گا۔ بڑے چودھری نے جو کچھ بنایا ہے وہ ان کی تیسری نسل کے ہاتھوں برباد ہونا ہے۔

چودھری غلام نبی ایک آرام دہ بستر پر پڑا رہتا ہے۔ دُنیا بھر کی نعمتیں اس کے قدموں میں ہیں۔ مگر وہ اس پر حرام ہو گئی ہیں۔ ہل سکے گا تو کھا سکے گا۔ دواؤں کے سہارے جینا بھی

جینا ہی تو ہے۔ اس کے پاس اب وہ سب کچھ ہے جس کی ایک مضطرب اِنسان تمنا کر سکتا ہے۔ وہ اپنی تسخیر کی ہوئی دُنیا کو بجھی بجھی آنکھوں سے دیکھتا رہتا ہے۔ ارتقا کا کوئی کنارہ نہیں ..... اور ہوس کا کوئی پیمانہ نہیں۔

اُور زیادہ کی طلب کوئی نہ بھی کرے، تب بھی حیات کا انجام تو کسی نہ کسی صورت سامنے آ تا ہے..... آدمی سمجھتا نہیں۔ ہردے کے اندر خطرے کی گھنٹیاں آپ ہی آپ بجنے لگتی ہیں۔ جو کہتی ہیں: قناعت کرو۔ دم لو۔ ذرا رفتار آہستہ کرو۔ دن چڑھتا بڑی مستی میں ہے، اُترتا سستی میں ہے..... دن ڈھلنے کے وقت بہت سی احتیاطیں بے حد ضروری ہو جاتی ہیں۔

مجھے بھی ڈاکٹروں نے ہاؤ ہو والی زندگی سے گریز کرنے کی تنبیہہ کر دی ہے۔

ابھی ابھی ایسا ہونے لگا ہے کہ جیسے ہی میں ساتویں منزل کی اس کھڑکی میں کھڑا ہوتا ہوں، مجھے سامنے اس مین روڈ کے پار ایک جھگی نظر آنے لگتی ہے۔ اُور جھگی کے ٹاٹ والے پردے کی اوٹ سے دو زندگی سے بھرپور آنکھیں جھانکنے لگتی ہیں۔ ریشم میری رشتہ دار تھی۔ ایسی ہی دل کش جیسی خوبصورت اور چلبلی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ انگ انگ مستی میں چور۔ بھرے بھرے ہونٹ۔ گداز جسم اور بولتی چھلکتی آنکھیں..... اس کے علاوہ اس کے سراپا میں کیا تھا، مجھے کبھی نظر ہی نہ آیا۔ جب میں اپنی سائیکل اٹھا کر اپنے کام پر نکلتا تو اسے نہ جانے کیسے خبر ہو جاتی۔ ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر بولتی، آنکھوں سے مجھے روک لیتی ..... اُف وہ آنکھیں! ہمیشہ کچھ کہتی ہوئی! آج تک میں سمجھ نہیں پایا کہ آنکھوں کی زبان اتنی ظالم کیوں ہوتی ہے؟ جو بات زبان ساری زندگی نہیں کہہ سکتی، آنکھیں ایک پل میں کہہ دیتی ہیں۔ اور دوسری آنکھوں سے جواب بھی حاصل کر لیتی ہیں۔ کبھی کبھی جب بہت بے چین نظر آتی تو اپنا ہاتھ باہر نکالتی۔ میں ذرا سہما اِدھر اُدھر دیکھ کر اس کے ہاتھ کو یوں چوم لیتا جیسے سونگھ کر چھوڑ دیا ہو۔ تب اس کی چاندی کے سکوں جیسی کھنکتی ہنسی پردے کی اوٹ میں دیر تک گھنگرو بجاتی مجھے سنائی دیتی رہتی......

وہ گویائی سے لبریز آنکھیں اور وہ بے اختیار سی ہنسی۔ اس کا پورا وجود اِن ہی میں کہیں چھپ جاتا۔ وہ میرے دل میں اپنے آپ اُتر آئی تھی اور میں سوچا کرتا کہ مکان جیسی کٹیا میں

میلے لباس میں ملبوس شیشے جیسا بدن تصور کی منڈیر پر چاند کیسے بنَ جاتا ہے؟ جوانی کا موسم تو خوشبو سے لبریز ہوتا ہے...... خالی ہاتھ جانے نہیں دیتا۔

پھر یہ بات ہم دونوں کے خاندان میں چلی اور ارتقا کے اِس موڑ پر رُک گئی جہاں مَیں ساری جھونپڑیاں خالی کرا رہا تھا۔ میں بہت دُور نکل گیا۔ اس نے آنسوؤں میں گوندھ کر مجھے کئی خط لکھے۔ پھر میں نے سنا کہ اس کا رشتہ کہیں طے ہو گیا ہے۔ شادی سے پہلے اس نے جھ سے ملنے کی خواہش لکھ بھیجی...... ''پاگل ہے!'' یہ کہہ کر میں نے وہ چٹھی پھاڑ دی تھی۔

یوں تنہا میں کب رہا؟ پہلی شادی کی تو بیوی حادثے میں مر گئی۔ دوسری بیوی مجھے چھوڑ گئی۔ تیسری میں نے شوقیہ ولایتی میم کر کے بدیسی شراب کا مزہ چکھا' جو سر چڑھ کر بولا...... اس کو وہیں طلاق دے کر آ گیا۔ چوتھی بار گھر بسایا۔ یہ کوئی بیوہ تھی۔ آسرا مانگتی تھی۔ اولاد کسی سے نہیں ہوئی۔

آج کل اس فلیٹ میں آرام کی زندگی بسر کرتا ہوں۔

ساری مارکیٹ مجھے سیٹھ جی' سیٹھ جی کہتی رہتی ہے۔

میرا ایک سنیاسی دوست کئی بار بتا چکا ہے کہ جب آدمی پچاس کا ہو جائے تو اُس نے جو کچھ حاصل کر لیا ہو اُس پر قناعت کر کے اپنی ہوس کا پیمانہ ذرا چھوٹا کر لینا چاہیے۔ باقی کی عمر اس کمائے ہوئے سے لطف اندوز ہونے کی ہوتی ہے کہ بہت سی تمنائیں پچاس کے بعد جاگتی ہیں۔ ان میں شدت نہیں' مانگ ہوتی ہے۔ زندگی کی سمجھ آنے کے بعد ہی دُنیا کی خوبصورتی کے راز کھلتے ہیں۔ مگر یہ دل...... یہ تو دوڑتا ہی رہا۔ دولت' عزت' شہرت' اقتدار...... ہر شے دل لبھانے والی تھی۔ لگتا یہی تھا کہ دوڑ ہی زندگی ہے۔

مگر اب جب مجھے انجائنا کی تکلیف رہنے لگی ہے اور ڈاکٹروں نے مجھے آرام اور پرہیز کا مشورہ دے رکھا ہے تو یکایک مجھے خیال آیا: مقام دل تو ابھی آیا نہیں...... یہ دل کو کیا ہونے لگا ہے؟ یہی اصل کائنات ہے شاید......

تاریخ' جغرافیہ' ارتقا...... ارتقا...... آنکھوں کے آگے سے زمانہ گزرا چلا جا رہا ہے...... مگر

وہ ایک لمحہ اچانک اِسی ایک جگہ پہ اٹک گیا ہے۔ جہاں اب ہینڈی کرافٹس کا خوبصورت شوروم ہے، وہاں کبھی ایک ریشمی جھگی ہوا کرتی تھی۔ وہاں ٹاٹ والے پردے کے پیچھے چوڑیاں چھنکا کرتی تھیں۔ دوستانی آنکھیں مستی کے کٹورے چھلکایا کرتی تھیں۔ سائیکل والے کا دل دھڑکا کرتا تھا۔

اس دل کا مقام تو جھگی کی دہلیز پر تھا!

☆☆☆

دل کا سورج

گھر سے میں نکلا تھا محبت کی تلاش میں اور پہنچ گیا ہسپتال میں......!

محبت کم بخت چیز ہی ایسی ہے۔ اس کے پیچھے آدمی کبھی جیل کی کال کوٹھڑی میں جا نکلتا ہے' کبھی پردیس کی خاک چھانتا ہے اور کبھی صحرا کے ذروں سے بغلگیر ہو کر پیراہن تار تار کرتا رہتا ہے۔

ہسپتال کی لابی میں حسب معمول بڑا رش تھا۔ آج ہی ایک بس کے اندر بم پھٹا تھا اور خون میں ڈوبے ہوئے جسم ایمرجنسی وارڈ میں لائے جا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے دنیا میں زخم' خون اور پٹیوں کے سوا کچھ رہا ہی نہیں۔ بندہ وحشی بھی ہے' بندہ سخت جان بھی ہے۔ میں اپنے گھٹنے پہ اپنا پورا ہاتھ رکھے گویا اس سرخ اور گرم خون کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا جو میری جوانی کی علامت تھا' مگر جس طرح جوان خون میں اُبال بڑی جلدی آ جاتا ہے اسی طرح بہتے خون میں اتنی تیزی تھی کہ ہتھیلی کا سینک اسے روک نہیں پا رہا تھا۔

اس ہسپتال میں ڈاکٹر ناصر سے میری قرابت داری تھی' اسی لیے میں سیدھا یہاں آ گیا تھا۔ میں آتے ہی پہلے ان سے ملا۔ انھوں نے دیکھ کر بتایا کہ شکر کرو تمہاری ہڈی نہیں ٹوٹی' بس ضرب آئی ہے' پٹی کروانے سے خون رُک جائے گا۔ تھوڑی دیر کے لیے باہر بیٹھو' بم دھماکے کی وجہ سے ایمرجنسی میں آج بڑا رش ہے' متعلقہ ڈاکٹر کے فارغ ہوتے ہی تمہیں وہاں بھیج دوں گا۔

ڈاکٹر تو کہہ کر فارغ سے ہو گئے کہ بس صرف ضرب آئی ہے مگر ضرب تن کے پنجرے میں کیا کچھ توڑ جاتی ہے' انہیں کیا معلوم۔ ابھی تک میں غصیلے جذبات کے بھنور میں پھنسا ہوا تھا اور مجھے ذرا بھی احساس نہیں ہو رہا تھا کہ میرے سامنے سے انسانیت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گزر رہی ہے۔

انسان، انسان کی بہیمیت کا نوحہ کر رہا ہے اور یہ سب معصوم لوگ نہ جانے گھر سے کیا کرنے نکلے تھے اور نہ جانے کس پاداش میں اپنے جسم کے قیمتی اعضا سے محروم ہو گئے ہیں۔

بلا سے...... مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ آج دُنیا کا سب سے بڑا دھماکا میرے اندر ہوا ہے۔ میرے دل کے ہیروشیما پر ایٹم بم پھٹا ہے اور ریزے اُڑ اُڑ کر دُور تک جا رہے ہیں۔ میں اپنے دل کے ریزے چنوں یا اپنے وجود کے اضطراب کو سمیٹوں؟

ہسپتال کبھی بھی نظارہ گاہ نہیں تھا۔ وہاں دُکھ ہی دُکھ نظر آتے ہیں۔ وہی لوگ جو اکثر ٹی وی پر آ کر کہتے ہیں: ''جی! میں دُکھی اِنسانیت کی خدمت کروں گا۔'' وہی پہلے اِنسانیت کو دُکھی کرتے ہیں اور پھر خدمت کا بہانہ ڈھونڈنے لگتے ہیں اور یہ بم دھماکے میں مجروح ہونے والے کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کریں گے؟ کیا یہ خدا کے ہاتھوں دُکھی ہو کر یہاں پہنچے ہیں؟ یونہی خون میں پھر جوش آنے لگا تھا۔ رگیں شدتِ احساس سے پھولنے لگی تھیں۔ مجھے اِن ''دُکھی اِنسانیت'' ایسے لفظوں سے شدید نفرت محسوس ہونے لگی۔ لوگ محاورے بنا لیتے ہیں۔ پھر ان محاوروں کو اوڑھ کر زندگی بتانے لگتے ہیں۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ میری جینز میں سے خون کے قطرے فرش پر ٹپکنے لگے تھے۔ میں نے ٹشو پیپر سے ہتھیلی صاف کی اور گھٹنے پہ رکھ کے اس کا زاویہ بدلا۔

سامنے ہسپتال کی لابی کا صدر دروازہ کھلا۔ پہلے ایک پانچ چھ سال کی بچی اندر داخل ہوئی۔ اس کے بعد جوان عورت اور اُن کے پیچھے ایک معمر عورت رینگ رینگ کر چلتی ہوئی اندر آ گئی۔ یا اللہ! میں انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں ایک ہی انسان کا پہلے بچپن دیکھ رہا ہوں، پھر جوانی اور اس کے بعد بڑھاپا! ننھی بچی ہو بہو اپنی ماں کی تصویر تھی اور اس کی ماں کے نقش و نگار کا چوکھٹا بالکل اس کی نانی جیسا تھا۔

مجھے اندازہ لگاتے دیر نہ لگی کہ معمر عورت ماں تھی، جوان عورت بیٹی تھی اور چھوٹی بچی نواسی تھی۔ ایک ہی شکل میں 'مَیں' تین زمانے دیکھ رہا تھا۔ ماضی، حال، مستقبل! پہلی بار میں خالق کی کاریگری پر چونک سا گیا۔ ہر گھر میں گویا وہ ایک ہی سانچہ تواتر سے دُہرائے جا رہا تھا۔ صرف

گزرتا ہوا زمانہ اس راز کا محرم تھا۔ نسلوں کی نسلیں آگے منتقل ہو رہی ہیں' مگر جوانی اتنی منہ زور ہے کہ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی زحمت نہیں کرتی اور معصومیت اتنی دلکش ہے کہ نقش و نگار کو جانچنے کی مہلت نہیں دیتی۔

میں ان تینوں کو اور ان کی حرکات و سکنات کو غور سے دیکھ رہا تھا یا شاید ان کے قریب آ کر بیٹھتے ہی ماضی حال اور مستقبل کے فلسفے پر غور کر رہا تھا کہ ایک جوان آدمی جو سامنے کھڑا تھا' فوراً آ کر اِن کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا۔ غالبًا وہ اس بچی کا باپ تھا' جوان عورت کا شوہر تھا' اور بوڑھی عورت کا داماد تھا۔ یقیناً اس نے جوان لڑکی کی صورت دیکھ کر شادی کی ہامی بھر لی ہوگی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی اپنی ساس کی صورت پر رُک کر یہ نہیں سوچا ہوگا کہ ایک روز میری بیوی بھی اتنی بدوضع ہو جائے گی۔

میں اس مرد کی چبھتی نگاہ سے گھبرا کر ایک دم کھڑا ہو گیا۔ جھٹکے کی وجہ سے درد کا احساس بھی شدید ہو گیا۔ میرے کھڑے ہوتے ہی سامنے کے دروازے سے ڈاکٹر ناصر نمودار ہوئے۔ مسکراتے چہرے کے ساتھ اُنہوں نے کہا: ''آجاؤ بھئی!'' ورنہ شاید میں اپنے فطری غصے کے ہاتھوں دروازہ کھول کر ہسپتال سے باہر نکل جاتا۔

وہ مجھے ڈاکٹر سہیل کے کمرے میں لے گئے جو ابھی ابھی بہت سے خون آلود مریضوں کی پٹی کر کے فارغ ہوئے تھے' مگر ان کے چہرے پر بیزاری یا تھکاوٹ بالکل نہ تھی۔ ڈاکٹر سہیل نے مجھے اسٹریچر پر لٹا دیا اور قینچی سے میری جینز کاٹنے لگے۔ پھر بولے: ''ماس پھٹ گیا ہے۔ دو ٹانکے بھی لگیں گے۔''

''لگا دیجئے۔'' میں نے شان بے نیازی سے کہا' جیسے اُن پر احسان کر رہا تھا۔

''میں انجکشن لگا رہا ہوں' تمہیں درد کا احساس تک نہیں ہوگا۔'' اُنہوں نے مجھے تسلی دی۔ درد کا کوئی اور احساس بھی ہوتا ہے؟ صبح جو کچھ ہو چکا تھا' میرے سہنے کے لیے وہ ضرورت سے زیادہ تھا۔ اس کے باوجود میں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ مجھے بہتا ہوا خون اور ننگا زخم دیکھنے کا بھی حوصلہ نہیں ہوا۔ اپنی آنکھوں سے اپنی مرہم پٹی دیکھنے کا شوق بھی نہیں تھا۔ میں نے

منہ دوسری طرف پھیرا' ہر طرف نظارے بکھرے ہوئے تھے۔ اس کمرے میں بھی مرہم پٹی والے مریض لیٹے ہوئے تھے۔ کسی کی ٹانگ سہاروں کے ساتھ لٹک رہی تھی۔ کسی کی آنکھوں اور سر پر پٹیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ کسی کو ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ کوئی ہائے وائے کر رہا تھا۔ یہ دُکھی انسانیت تھی۔ پر کس کے کارن دکھی ہو کر وہاں آئی تھی اور کس جرم میں؟ کوئی کراہ رہا تھا۔ کسی کے لواحقین چپکے چپکے بین کر رہے تھے۔

یکا یک ایک بوڑھے پر میری نظر اٹک گئی۔ جھریوں سے بھرا ہوا کالا کلوٹا چہرہ۔ اس کی دونوں ٹانگوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور وہ پلنگ کے کٹہرے سے ٹیک لگائے' بے جان آنکھوں سے سب کو دیکھ رہا تھا۔ ایک کھردرے چہرے والا تقریباً پینتالیس سالہ جوان اس کے پاس کھڑا تھا' اور پائنتی کی طرف چودہ پندرہ سال کا تر و تازہ لڑکا ہاتھ میں پکڑا سیب کھا رہا تھا۔ تینوں اپنی وضع قطع سے دیہاتی معلوم ہوتے تھے' لیکن جس احساس نے اچانک میری نگاہ کی ڈور پکڑ لی' وہ وہی سلسلہ تھا...... نقوش کی منتقلی کا۔ جوان آدمی' بوڑھے کا جوان روپ لگ رہا تھا اور تر و تازہ لڑکا اپنے باپ کے بچپن کی تصویر کی عکاسی کر رہا تھا۔ مجھے پھر اندازہ لگاتے دیر نہ لگی کہ تین نسلیں ایک ہی پلنگ کے دائرے میں کھڑی ہیں۔ پوتا' بیٹا' دادا...... کتنی مشابہت تھی ان تینوں میں۔ یا پھر میرے اندر کی کوئی آنکھ کھل گئی تھی' جو دیکھ رہی تھی۔ ایک ہی جیسے چہروں کی فصل اُگانے کا سلسلہ گویا اَزل سے جاری ہے اور اَبد تک جاری رہے گا۔ بس زمانے کا چکر' انہیں آگے پیچھے کرتا رہتا ہے اور ایک گھر سے دوسرے گھر میں منتقل کرتا رہتا ہے۔

کتنا عظیم فن کار ہے مالک!

پھر نہ جانے کیا ہوا کہ میری نظر ہر مریض کے بستر پر گئی' اور تیمار دار کے نقوش میں قرابت داری کی کڑیاں تلاش کرنے لگی۔ جیسے ان کے خونی رشتے مجھے ان کے چہروں میں نظر آنے لگے۔ یکایک گٹھڑی کی صورت میں ڈھیر ایک بڑھیا کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ اپنی رُت میں یہ کتنی جوان' کڑیل اور خوبصورت ہوگی' اب ریت کا ایک ڈھیر بنی پڑی ہے۔ دوسری طرف ایک خوبرو لڑکی بے ہوش پڑی تھی اور پلکوں کی بند جھالر کے ساتھ کتنی اچھی لگ رہی تھی۔ اسے کچھ

بھی معلوم نہیں تھا کہ آنے والی عمر میں ایک حادثہ پیش آنے والا ہے' جو اس کے نقوش اور نفس کی تمام رعنائیاں اس سے چھین لے گا۔

میں چہروں کے اس سیلاب میں اپنے فلسفے کا چراغ جلا کر نہ جانے کس حد تک یہ گتھیاں سلجھانے میں لگا رہتا کہ ڈاکٹر سہیل نے میرا کندھا تھپتھپایا اور بولے: ''اُٹھو ہیرو' تمہارا کام ہو گیا ہے۔''

میں نے چونک کر اپنی ٹانگ کو دیکھا' پھر ڈاکٹر کو دیکھا تو اُنہوں نے مجھے اپنی مشاقی کا احساس دلایا۔

''شکریہ ڈاکٹر۔'' میں اسٹریچر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''کیا میں اسکوٹر چلا سکتا ہوں؟''

''بہتر ہے' دو تین دن آرام کرو۔ پرسوں آکر پھر پٹی کروا جانا' کیونکہ کافی خون بہہ چکا ہے۔ البتہ تم چل پھر سکتے ہو۔''

''مگر ڈاکٹر' میں تو یہاں تک بھی اپنے اسکوٹر پر ہی آیا تھا' کیونکہ یہ حادثہ راستے میں پیش آیا تھا۔ وہاں سے یہاں کوئی لانے والا نہیں تھا۔ اب اسکوٹر سمیت مجھے کوئی گھر پہنچانے والا نہیں ہے۔''

''تو پھر ایسا کرو' صرف گھر تک اسکوٹر چلا کر چلے جاؤ۔ میں نے درد روکنے کا ایک انجکشن لگا دیا ہے' یہ گولیاں لکھ دی ہیں۔ درد زیادہ ہونے لگے تو دو دو گھنٹے بعد کھاتے رہنا۔ کوئی پرابلم ہو تو مجھے فون کر لینا۔''

''تھینک یو ڈاکٹر۔'' آج کل اگر سرکاری ہسپتال کا کوئی ڈاکٹر اتنا بھی کہہ دے تو آپ اسے اپنی خوش نصیبی تسلیم کریں۔

میں کھڑا ہو گیا' اگرچہ ٹانگ میں اینٹھن تھی' مگر درد نہیں تھا۔ میں ذرا لنگڑا کر چلتا ہوا باہر آ گیا۔ میرے ساتھ ہی ایک اسٹریچر باہر نکل رہا تھا' جس پر ایک مردہ جسم پڑا تھا۔ ساتھ میں ایک مرد اور دو عورتیں روتے ہوئے جا رہے تھے۔ یوں ہسپتالوں میں ہر گھڑی ایسے اسٹریچر آتے جاتے نظر آتے ہیں۔ میں اگر کسی ہسپتال میں کسی کی عیادت کو جاؤں تو ایسا نظارہ دیکھنے کی کوشش

نہیں کرتا' جہاں زندگی' موت سے ہار کر جارہی ہو۔ خواہ مخواہ سارا دن دل برا ہوتا رہتا ہے اور بدشگونی بھی لگتی ہے اور باقی لوگ بھی اس کی طرف ایسے دیکھتے ہیں جیسے یہی بیچارہ مرا ہے۔ ان کے ساتھ ایسا نہیں ہوسکتا' یا پھر سب کے لاشعور میں کچھ ایسا ہوتا ہے کہ ایک دن ہمارے ساتھ بھی یہی ہونا ہے۔ کیوں دیکھیں اپنے آپ کو؟

مگر آج میں نہ جانے معرفت کی کن منزلوں میں تھا کہ میں نے اس مرے ہوئے بوڑھے کا چہرہ بڑے غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر اتنی جھریاں تھیں کہ ان کی اوٹ میں نقوش مسخ ہو چکے تھے۔ وہ ایک ایسی تصویر کی طرح لگ رہا تھا جس کو کسی بچے نے بے شعوری میں بنایا ہو اور رنگوں کے بے جوڑ استعمال سے آنکھ' ناک' کان' ہونٹ' ہر نقش کا مقام ہی بدل دیا ہو۔ رونے والی عورتوں پر نظر ڈالی۔ ایک تو اس کی بیٹی لگ رہی تھی۔ دوسری یقیناً بیوی ہوگی۔

باہر نکلا تو ہسپتال کے لان میں بے شمار مریض اور ان کے لواحقین اپنی اپنی باری کے انتظار میں گھاس پر بیٹھے ہوئے تھے۔ چھوٹی چھوٹی گٹھڑیاں اور پوٹلیاں ان کے آس پاس رکھی تھیں۔ ان کے حلیوں سے لگ رہا تھا کہ دُور دراز کے قصبوں اور دیہاتوں سے آئے ہیں۔ ایسے مطمئن بیٹھے تھے' لیٹے تھے' گویا ہسپتال میں نہیں آئے' میلہ دیکھنے آئے ہیں اور انہیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں۔ شام تک اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے رہیں گے۔ پھر رات ہو جائے گی۔ سر کے نیچے پوٹلیاں رکھ کر بس گھاس پھونس پر بسیرا کرلیں گے۔ واپس جا کر دوبارہ آنے کی ان میں استطاعت کہاں ہے؟ میں سیڑھیوں پر بیٹھ کر ان کا مشاہدہ کرنے لگا۔ جوان کو بوڑھا ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے؟ ایک بیماری ساری وجاہت اور دلکشی لے کر اُڑ جاتی ہے۔ کوئی اپنے مضبوط دانتوں سے گنڈیریاں چوس رہا تھا تو کوئی اپنے پوپلے منہ کے اندر نوالہ ڈال کے کاغذی چکی کے دوپاٹ چلا رہا تھا۔!

عجیب......عجیب......

میں جھلا کر اسکوٹر کی سمت آیا۔ شکر ہے کہ چوٹ بائیں ٹانگ کو لگی تھی۔

میں نے ایک جھٹکے سے اسکوٹر اسٹارٹ کیا' اور پتا نہیں کس طرف روانہ ہوگیا......

یہ صبح بھی میرے ساتھ یہی ہوا تھا۔ اندر ایک جھکڑ چلا تھا۔ وہ مجھے اُڑا کے سڑکوں پر لے آیا...... کہیں دُور نکل جانے کی دھن میں کہیں دور نکلا جا رہا تھا...... اس عمر میں اپنے خوابوں کی ہار تسلیم کر لینا اتنا آسان کہاں ہے؟ خوفناک بنا دیتا ہے۔

فریحہ نے میرے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

فریحہ میری پھوپھی زاد ہے! انگلینڈ میں رہتی ہے۔ پھوپھی اور پھوپھا نے عرصہ پہلے نقلِ مکانی کر کے وہاں ایک گروسری اسٹور کھول لیا تھا۔ دو چار سال بعد آ جاتے تھے۔ دو سال پہلے آئے تو میں فریحہ کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ وہ تو مغرب اور مشرق کے حسن کی ایک ایسی آمیزش بن چکی تھی جس کا نشہ دو آتشہ ہو جاتا ہے۔ سرخ و سفید ملائم چہرہ جیسے کوئٹہ کے سیب' اور اتنے لمبے چمکیلے بال جیسے مری کی گھٹائیں۔ اس پر اس کا اٹک اٹک کر اُردو بولنا اور فر فر انگریزی میں ہر ایک کو ڈانٹنا ڈپٹنا...... میں تو مر مٹا۔!!

جی ہاں۔ آج کل مَیں اپنے خاندان کا نمبر ایک لڑکا ہوں۔ سی ایس ایس' ایک قابلِ رشک پوسٹ۔ شکل و صورت ایسی' جیسے فلمی ہیرو۔ لوگ تعریف کرتے ہیں تو اِتراتا بہت ہوں۔ لڑکیوں کو گھاس نہیں ڈالتا۔ اگر وہ گھایل ہو جائیں تو انہیں تڑپاتا بہت ہوں' ستاتا بہت ہوں۔

جب فریحہ ہمارے گھر آئی تو مجھے یوں لگا' جس اپسرا کی مجھے تلاش تھی وہ یہی تو ہے۔ بڑی جلدی اسے بھی سمجھ آ گئی کہ میں اس پہ مرمٹا ہوں۔ پھر تو وہ مجھے ڈھیٹ کرنے کا کوئی بہانہ ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔ شادی سے پہلے محبوبہ کی ایسی ادائیں بھی دل کو لگتی ہیں۔ ان کے جانے میں جب تھوڑے دن رہ گئے تو میں نے اپنی امی سے کہہ دیا کہ وہ بات ضرور کر لیں۔

ایک دن فریحہ دندناتی میرے کمرے میں آ گئی اور حاکمانہ انداز میں بولی: ''تم پاکستانی لڑکے اتنے بودے کیوں ہوتے ہو؟''

''کیوں؟ کیا کیا ہے ہم نے؟'' میں نے ہونقوں کی طرح پوچھا۔

''تم خود مجھے کیوں نہیں بتا سکے کہ تم مجھے چاہتے ہو' حالانکہ جس دن تم نے مجھ پر پہلی نظر ڈالی تھی' مجھے پتا چل گیا تھا کہ تم پھسل گئے ہو۔''

پتا نہیں کیوں؟ اس کے سامنے میری حالت عام لڑکوں جیسی ہو گئی۔ چہرہ سرخ ہو گیا' دھڑکن تیز ہو گئی' زبان کو تالے لگ گئے۔ کبھی تصور ہی نہیں کیا تھا کہ وہ اس طرح میرے سامنے کھڑی میرے دل کی اُمنگ پر جرح کر رہی ہو گی۔ اس کی یہ منہ زور ادا بھی مجھے ہی اسیر کر گئی۔

''ایڈیٹ!!'' اس نے لہرا کر کہا۔ اور ادا سے باہر نکل گئی۔

میری پھوپھی بھی چاہتی تھیں کہ یہ رشتہ طے ہو جائے۔ اب وہ انگلینڈ سے اُوب چکی تھیں اور اپنی بیٹی کے ناتے واپس پاکستان آنا چاہتی تھیں۔ سارے گھر میں خوشبودار کھچڑی پکنے لگی اور میں فریحہ کے ساتھ شہر نوردی کرنے لگا۔

کونسا کونا تھا لاہور شہر کا جو میں نے اسے نہیں دکھایا اور کون سا ریستوران تھا جہاں ہم نے رات کا کھانا نہیں کھایا۔ میں نے اس کے انداز میں اس پر فدا ہو کر دکھا دیا اور اس نے بھی ہاں کر دی۔

ہماری منگنی ہو گئی۔ منگنی کی انگوٹھی بھی اس نے اپنی پسند سے خریدی۔ طے یہ ہوا کہ اس کی تعلیم کا ایک سال باقی ہے' چنانچہ تعلیم ختم ہوتے ہی اگلی گرمیوں میں شادی کر دی جائے گی۔ فریحہ اپنے والدین کے ہمراہ انگلینڈ چلی گئی۔

اور پھر محبتوں کے تسلسل کا ازلی سلسلہ شروع ہو گیا۔ طویل تر خطوط' ٹیلی فون کالیں' فیکس کے تبادلے' تصویروں کے البم...... یہ ساری بے جان چیزیں زندگی کا ارمان بن گئیں...... ہر شے محرمِ راز بن گئی' خطوں سے خوشبو آنے لگی' ٹیلی فون کی آواز میں موسیقیت رچ بس گئی' فیکس پر فریحہ کی شبیہیں اُبھرنے لگیں۔ زمانہ گویا اپنا ہو گیا۔

ایک سال گزر گیا۔ ہم شادی کی تاریخ مانگنے لگے' اُدھر سے ٹال مٹول ہونے لگی۔ خط یک طرفہ ہو گئے۔ ٹیلی فون کالیں ''ہائے ہیلو'' تک محدود ہو گئیں۔ تقاضے اختلاف محسوس ہونے لگے اور اختلاف لڑائیوں میں ڈھلنے لگے۔ تب انہوں نے سوئمبر جیسی کڑی شرط رکھ دی کہ اگر وہاب یہاں آ کے سیٹل ہو جائے تو ہم شادی کر دیں گے۔ ہماری لڑکی پاکستان میں رہنا پسند نہیں کرتی۔

محبت اگرچہ جنون ہے مگر اس میں ایک سیلانی لمحہ ضرور آتا ہے۔ کیا فریحہ مجھے خریدنا چاہتی تھی؟ وہ ماڈرن لڑکیوں کی طرح ایک پالتو پپی کا پٹا ہاتھ میں پکڑ کے دُنیا میں گھومنا چاہتی تھی؟ محبت کی ساری شنیدہ کہانیوں میں عورت کے ایثار اور تیاگ کی داستان ملتی ہے۔ جس سے محبت کرتی ہے اس کے لیے ملک مذہب اور زمین چھوڑ دیتی ہے۔ جس کو دل میں بٹھا لیتی ہے اس کے لیے خون کے ناتے توڑ دیتی ہے۔ جس کی نظروں کا پیغام پڑھ لیتی ہے اس کی بولی بولنے لگتی ہے۔ محبت کے سارے قصوں میں عورت ہی سب سے بڑی چھلانگ لگاتی ہے۔!

میں نے اپنے طور پر پتا لگانا شروع کیا۔ راز کھلا کہ فریحہ کا ایک کلاس فیلو مصری لڑکا ہے' اصل میں وہ اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ ماں باپ نے یہ منگنی زبردستی اس پیش بندی کے طور پر کردی کہ شاید بیٹی راہ راست پر آجائے۔

مگر جہاں فریحہ رہتی ہے وہاں اولاد کو جنم دے کر ماں باپ گناہ گار بن جاتے ہیں۔ اس لیے ان کی دخل اندازی کو اِنسانی بنیادی حقوق میں دخل درمعقولات سمجھا جاتا ہے۔

میرا شکست خوردہ دل صرف ایک بار پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے محبت کا یہ کھیل مجھ جیسے معصوم اور بے ضرر اِنسان کے ساتھ کیوں رچایا؟ مجھے ایک سال قوسِ قزح کا جھولا کیوں جھلایا؟ میری ضد پر اس نے آج صبح دفتر میں مجھے فون کردیا اور میرے کچھ کہے بغیر تیز تیز انداز میں بولی:

''جب میں سب کچھ اپنے والدین سے کہہ چکی ہوں تو اب تم مجھ سے کیا سننا چاہتے ہو؟ تم محض ایک بے وقوف اور جذباتی لڑکے ہو۔ میں ایسے لڑکوں کو پسند نہیں کرتی۔ آئی ہیٹ یوٗ آئی ہیٹ یوٗ آئی ہیٹ یو۔ سن لیا تم نے......؟'' یہ کہہ کر اُس نے فون رکھ دیا۔

میں دفتر سے اُٹھ کر گھر آیا۔ انگوٹھی اُتار کر اپنی امی کو دے دی اور کہا کہ باقاعدہ منگنی توڑ دیں۔ میری ماں نے خاموشی سے انگوٹھی لے لی۔

میں نے اپنا اسکوٹر اُٹھایا اور گھر سے نکل آیا۔ میں عام حالات میں اپنا اسکوٹر چلانا ہی پسند کرتا ہوں۔ گھر سے نکل تو پڑا...... مگر کہاں کدھر...... کیوں......؟ یار...... یہ محبت ہے......

یہ ذلیل سی شے محبت ہے جو اِنسان کا اوڑھنا بچھونا بن کر اس کا رویہ بن جاتی ہے۔ اسے

دُنیا سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ وہ اسی کے اندر جینے لگتا ہے' اسی میں مرنے لگتا ہے۔

یار...... یہ محبت ہے...... اسے محبت کہتے ہیں......؟

یہ ماڈرن لڑکیاں' مجھ جیسے مخلص لڑکوں کو جذباتی کہہ کر گالی دیتی ہیں۔ انہیں روبوٹ درکار ہیں' مشینیں پسند ہیں۔ پاؤنڈ اور ڈالر بنانے والی مشینیں' انہیں محبت کی گرمی نہیں چاہیے۔

میں چلا جا رہا تھا' ہواؤں پر اپنا غصہ نکالتا ہوا۔ جی چاہتا یہ محبت کہیں کسی موڑ پر مجسم مل جائے تو میں اس کے منہ پر کالک مل دوں' اس کی چٹیا کاٹ ڈالوں' اس کے لمبے بالوں میں آگ لگا دوں۔ اپنی ذلت کا بدلہ کس سے لوں......؟

یار لعنت ہے اس دل پر جو بے بسی کی انتہا پر ہے۔ وہ سب قصے کہانیاں' بکواس لکھنے والے کہاں ہیں کہ میں ان سے پوچھوں' محبت ہے کیا؟ کہاں ہوتی ہے؟ کیسی ہوتی ہے......؟

ذہنی' جسمانی اور خیالی ہذیان میں مبتلا' جانے کس طرف جا رہا تھا کہ ایک ٹرک نے مجھے ٹکر ماری' میں دور جا گرا۔ وہ زن سے نکل گیا۔ لوگ مجھے بچانے کو دوڑے' اور پل بھر میں مجمع لگ گیا۔ کوئی ٹرک والے کو گالیاں دے رہا تھا' کوئی اس کا نمبر نوٹ کرنے کا مشورہ دے رہا تھا' کوئی جوانی کو ہوشمندی سے رہنے کی ملامت کر رہا تھا...... دیکھ لیجئے۔ اس قوم کے پاس کتنا وقت ہے۔ حادثہ ہوتے ہی کیڑے مکوڑوں کی طرح نکل آتے ہیں' کھڑے ہیں' تبصرہ فرما رہے ہیں' پرانے حادثات دُہرا رہے ہیں۔ گویا حادثہ نہیں ہوا' کوئی دلچسپ ڈرامہ چل رہا ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی مجھے اُٹھا کے ہسپتال لے جانے کی بات نہیں کر رہا تھا۔

میں اسکوٹر سمیت جس طرح گرا تھا' اسی طرح کھڑا ہو گیا۔ میرے گھٹنے سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے غور کیا' ٹرک والے کا قصور نہیں تھا۔ شدتِ غیظ سے میں ہی غلط سمت مڑ گیا تھا اور یہ اخلاقی فرائض ٹرک والوں پر عائد نہیں ہوتے کہ ٹکر بھی ماریں اور بعد ازاں معذرت کر کے ہسپتال میں بھی پہنچائیں۔ مجھے معلوم تھا کہ پولیس مین بھی تفریح کے موڈ میں ہی آئے گا۔ میرا اسکوٹر بالکل ٹھیک تھا۔ میں نے کسی صاحب سے کہا کہ وہ اسے اسٹارٹ کر دیں' میں سیدھا ہسپتال جاؤں گا۔

ہسپتال سے پٹی کروا کے نکلا' تب بھی میرے سامنے کوئی واضح منزل نہیں تھی ...... محبت کی تلاش صورتوں کے میلے میں گم ہو گئی تھی۔ شاید میں شہر سے باہر نکل آیا تھا۔

ڈھول بج رہا تھا۔ کچھ لوگ ڈھول کے ساتھ بھنگڑا ڈالتے آ رہے تھے۔ سامنے اونچے ٹیلے پر ایک مزار نظر آ رہا تھا۔ اس پر مختلف رنگوں کی جھنڈیاں لہرا رہی تھیں' لاتعداد سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ڈھول بجاتا گروہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ انہوں نے ایک زریں چادر اور پھولوں کا ٹوکرا بھی اُٹھایا ہوا تھا۔ عورتوں اور مردوں نے بچے اُٹھائے ہوئے تھے۔ کمر پر' سر پر' ہر عمر کے لوگ' تنومند جوان' بوڑھے بچے' عورتیں' مرد چیونٹیوں کی قطار کی مانند اُوپر جا رہے تھے۔

سب سے آخر میں ایک انتہائی ضعیف عورت بڑی مشکل سے زور لگا لگا کر سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں لکڑی کی ایک سوٹی تھی۔ وہ سوٹی کی مدد سے ایک سیڑھی چڑھتی اور پھر بیٹھ جاتی۔ اس کے چہرے پر اتنی جھریاں تھیں کہ آنکھوں کے سوا کوئی نقش واضح نہیں ہو رہا تھا۔ پوپلا منہ تھا' لکڑی کی طرح سوکھے ہاتھ تھے۔ سیاہ رنگ تھا' اب وہ بس ایک شے تھی۔

میں اسکوٹر سے اُتر کر اس کے قریب چلا گیا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے' جیسے ہوا کے اشارے پر کا[illegible] ہے۔ اس کے منہ میں ایک بھی دانت نہیں تھا' اس لیے ہونٹ بے سہارا سے ہو گئے تھے۔ یا پھر ہونٹوں کو یونہی ہلنے کی عادت سی ہو گئی تھی......!

وہ سمجھی کہ شاید میں اس کی مدد کرنے آیا ہوں۔ زور سے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا' اور دم لینے کے بہانے ایک سیڑھی پر بیٹھ گئی۔ میں اس کا جائزہ اس طرح لینے لگا جیسے میں نے پہلی بار کوئی انسان دیکھا ہو...... کیا یہ انسان ہے......؟

اس کے اندر کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ سوکھی ٹہنیوں کا ایک فریم تھی' جس پر کاغذی ماس لگا ہوا تھا۔ مجھے دیکھا تو بولی: ''چڑھ جاؤں گی' ساری سیڑھیاں خود چڑھ جاؤں گی۔ اب ایسی گئی گزری بھی نہیں ہوں۔ میں نے ہی منت مانی تھی کہ سات بیٹیوں پیچھے اگر میرے بیٹے کے ہاں بیٹا ہوگا تو خود چادر چڑھانے آؤں گی۔ اپنے ہاتھ سے چڑھاؤں گی۔ اپنے پاؤں سے چل کر آؤں گی......؟''

مَیں نے اُوپر کی طرف دیکھا۔ کاسنی پگڑی والا ایک آدمی ایک نومولود کا جھولا اُٹھائے

سب سے آگے آگے اوپر جا رہا تھا۔ اس کے قدموں میں وراثت کا غرور شامل تھا۔

بڑھیا نے اپنی سیاہ جھریوں پر بشاشت کا اجالا بکھیرتے ہوئے اپنے پوپلے منہ سے بتایا: ''آج سوا مہینے کا ہو گیا ہے۔ ہم منت اُتارنے جا رہے ہیں...... مگر میں خود...... خود......'' اسے کھانسی کا دورہ پڑا۔ کھانس کر بولی: ''خود اپنے قدموں سے چڑھ کر جاؤں گی...... میری یہی منت تھی......!''

اسی وقت جھولے والے گھبرو نے مڑ کر نیچے کی طرف دیکھا۔ بڑھیا کو میرے ساتھ مشغول دیکھ کر وہ کڑکا: ''بے بے تو دیر لگا رہی ہے۔ تجھے پتا ہے' چادر چڑھانے کا وقت نکلا جا رہا ہے۔''

''آتی ہوں...... آتی ہوں......'' کاغذی بڑھیا میں بجلی دوڑ گئی۔ اس نے سونٹی کا سہارا چھوڑ دیا اور کھڑی ہو کر دونوں ہاتھوں اور دونوں پیروں کی مدد سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اب کے اس کا دم لینے کا ارادہ نہیں تھا۔ اس لیے اس کاغذی لفافے میں سانسوں کا اُتار چڑھاؤ صاف محسوس ہو رہا تھا۔ اس اثناء میں دو تین عورتوں نے بھی جھانک کر اُسے دیکھا اور ''بے بے...... بے بے...... جلدی کر''...... کہہ کر اُسے آوازیں دیں۔

ہاتھوں اور پاؤں کی مدد سے چڑھتی' کالے کپڑوں میں ملبوس وہ جھریوں زدہ میلی کچیلی بڑھیا دُور سے بالکل چوپایہ لگ رہی تھی۔ اس کی سہارے والی سونٹی گزری عمر کی طرح پچھلی سیڑھیوں پر پڑی رہ گئی تھی۔ جن لوگوں نے زور زور سے اسے صدائیں دی تھیں اور یہ بھی کہا تھا: ''ہائے ہائے تمہیں تو ساتھ لانا مصیبت ہو گیا......'' ان میں سے کوئی بھی سہارا دینے آگے نہیں آیا تھا۔ بڑھیا کی بسیار کوششوں کے باوجود سیڑھیاں ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھیں۔ بڑھیا کو پتا بھی نہ چلا کہ ڈھول کی تھاپ بند ہو گئی تھی۔ بیٹے اور بہو نے چادر چڑھا بھی دی تھی' تبرک بھی تقسیم ہو گیا تھا۔ بوڑھی دادی' جسے پوتا دیکھنے کا ارمان تھا' جس نے بڑے چاؤ سے منت مانی تھی' ابھی ابھی وہ ہانپتی کانپتی فاصلے طے کرتی اوپر پہنچی تھی کہ اس کے لوگوں نے نیچے اُترنا شروع کر دیا تھا۔ اب کے پنگوڑا ایک عورت کے ہاتھ میں تھا' اور وہ جیسے پھلانگ کر سیڑھیاں اُتری۔ نیچے آ کر ایک طرف بیٹھ گئی۔ پنگوڑے میں سے نرم ملائم' خوشبو سے بھرا ہوا ریشمی بچہ نکالا اور اسے دودھ پلانے لگی۔

میں نے بچے کی جھلک دیکھ لی۔ واقعی خوبصورت تخلیق تھی۔ کبھی اس کا باپ بھی اس جیسا ہوگا اور اس مکروہ صورت بڑھیا نے اتنے ہی ارمانوں سے اسے جنم دیا ہوگا۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ شملے والا باپ نیچے آ رہا تھا اور اُوپر سیڑھیوں کے سرے پر بیٹھی ہانپتی بڑھیا حسرت سے نیچے دیکھ رہی تھی حالانکہ اُترنا' چڑھنے کی نسبت آسان ہوتا ہے۔

باپ نیچے اُتر کر اپنی بیوی کے آگے کھڑا ہوگیا۔ گویا اس نے بچے پر سایہ کر دیا۔ دونوں کی صورت ایک جیسی تھی۔ اچانک مجھے اپنی ماں یاد آگئیں۔

جب بھی کوئی میری تعریف کرتا' وہ ہمیشہ کہتیں:

''وہاب بالکل اپنے باپ پر ہے، ہو بہو......!'' میرے ابا پر جب سے فالج کا حملہ ہوا تھا' وہ بستر پر پڑے رہتے تھے۔ مجھے ان کے مرجھائے ہوئے بدوضع نقوش دیکھ کر غصہ آجاتا۔ ایک دن میں نے اپنی امی سے کہہ دیا: ''امی آپ ہر آئے گئے سے کہنے بیٹھ جاتی ہیں' وہاب تو بالکل اپنے ابا کی تصویر ہے' میری شکل ذرا بھی ابا سے نہیں ملتی۔ ذرا اِن کو دیکھیں' میں ایسا ہو سکتا ہوں؟''

میری امی کو اس بات پر شدید جھٹکا لگا۔ کچھ دیر میری طرف دیکھتی رہیں۔ پھر مری ہوئی آواز میں بولیں: ''تو نے اپنے ابا کی جوانی نہیں دیکھی!''

ٹھنڈی آہ بھر کر انہوں نے میری طرف دیکھا' پھر سوئے ہوئے ابا کی طرف دیکھا۔ شکر ہے انہوں نے میری بات نہیں سنی۔ امی کی نظر صاف کہہ رہی تھی کہ ماں باپ کی محبت' شکل وصورت سے ماورا ہوتی ہے' مگر اس کے بعد انہوں نے میری شباہت کی بات کرنی چھوڑ دی تھی۔

میں نے نظر اُٹھا کر سامنے دیکھا۔ سورج کا جلال آفریں تخت بادلوں میں کھبا جا رہا تھا اور اس کو حوصلہ دینے کے انداز میں سرخ شعاعیں اس کے اِرد گرد جمگھٹا کئے ہوئے تھیں۔ بادلوں کے رنگ اُڑے اُڑے تھے۔ یہ وہ سورج نہیں تھا جو صبح صادق کے وقت طمطراق سے طلوع ہوا تھا اور دُنیا بھر میں حرارت دوڑ گئی تھی۔ دُنیا کو رات کی بھی اشد ضرورت ہے اور رات کا تقاضا تھا کہ سورج خود بخود ڈوب جائے۔

میں نے گویا سورج کو پہلی بار سمجھا۔ وہاں سے نظر ہٹا کر آخری سیڑھی پر بیٹھی کریہہ المنظر

بڑھیا کی طرف دیکھا جو ماتھے پہ ہاتھ رکھے بالکل چوپایہ بنی بیٹھی تھی۔ پھر پگڑی والے جوان گبھرو کو دیکھا۔ اس کا شملہ تنا ہوا تھا۔ اس کی بیوی کو دیکھا جو اپنی کوکھ کے غرور کو ہاتھوں پر اچھال رہی تھی......

میں تڑپ کر اُٹھا' لپک کر اسکوٹر اسٹارٹ کیا۔ میری ٹانگ کا درد جانے کہاں چلا گیا تھا۔ مجھے یوں لگا' اسٹارٹ ہوتے ہی میرا اسکوٹر سورج کے طشت سے ٹکرایا ہے اور سورج کا سرخ تھال میرے دل میں گھس آیا ہے' اتنی روشنی ٹوٹ کر اندر گری ہے کہ ہر معاملہ صاف نظر آنے لگا ہے...... ابا...... امی...... جوان نسل...... پرانے لوگ......

عظیم دیالو...... جو دینے پر آئے تو سورج بنا دے...... لینے پر آئے تو کاغذی پیراہن پہنا دے۔ عظیم تر مصور...... جس نے رنگوں کا برش وقت کے ہاتھ میں دے رکھا ہے...... چھوڑو یار...... یہ عشق و محبت کے فرسودہ قصے...... جب انسان کو ثبات نہیں...... چہروں کو حیات نہیں...... اعضاء کی معیاد نہیں اور دل جیسی کوئی ایجاد نہیں...... اگلی سیڑھیوں پر چڑھنے کی ہمت نہیں اور چڑھ کر اُترنے کی مہلت نہیں۔

زندگی کے گلے شکوے جیسے سورج کی روشنی میں ڈھل گئے۔ کیا اتنی قیمتی زندگی محض ایک مصنوعی ساخت کی لڑکی کے لیے ضائع کر دی جائے؟ اُور بھی تو دُنیا میں بڑے کام ہیں کرنے والے! مثلاً ابا کی خدمت کی سعادت' میں جن کی ہو بہو تصویر ہوں۔ امی کی محبت کا حق' رافعہ میری بہن' جن کا حسین عکس ہے' عکس کو عکس میں ڈھلتے رہنا چاہیے......

میں تیزی سے اپنے گھر کی طرف رواں تھا مگر عجیب کیفیت میں تھا...... عجیب......

جو تمہارے اختیار میں ہے' بس وہی تمہارا ہے......

تمہارے اختیار میں صرف تمہارا آج ہے...... یہی تمہارا راج ہے......

بلکہ وہ لمحہ معرفت جو ابھی ابھی تمہارے دل پر اُترا ہے!

☆☆☆

کُڑیاں چڑیاں

چڑیاں میری نظر میں دُنیا کا سب سے احمق اور بے وقوف پرندہ ہیں۔ مجھے اُن کی حماقتوں پر دُکھ کم ہوتا ہے' غصہ زیادہ آتا ہے۔ اب یہی دیکھیے، ہمیشہ غلط جگہ پہ گھونسلہ بنائیں گی۔ مثلاً چھت میں لگے پنکھے کے اُوپر، کھلنے والے روشن دان کے اندر والے حصّے میں' پردوں کی جھالروں کے اندر' ایئر کنڈیشنر کے پچھلے حصے میں لپٹی ہوئی چق کے اندر یا عارضی طور پر بند کیے جانے والے دروازہ کے پیچھے۔

اس ملک میں سردی کے دن ہی کتنے ہیں۔ سردی تو سسرال سے آئی ہوئی لڑکی کی طرح بس چند دن کی مہمان ہوتی ہے۔ لوگ باگ اُبھی ہاتھ سینکنے کی حسرت پوری کر نہیں پاتے کہ سردیاں رخصت ہو جاتی ہیں۔ پھر بند دروازے کھولنے پڑتے ہیں۔ چقیں لٹکانی پڑتی ہیں۔ روشن دانوں کی گرد جھاڑنی پڑتی ہے۔ ایئر کنڈیشنر چالو کرنے پڑتے ہیں۔ اتنی سی بات ان بے وقوف چڑیوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ جونہی ایئر کنڈیشنر بند ہوا، چھوٹے سے سوراخ سے اندر گھس گئیں اور گھونسلہ بنا ڈالا۔ ایسے خفیہ طریقے سے تنکا تنکا اُندر لے جاتی ہیں کہ پتہ تک نہیں لگتا۔ پھر ایک دن موسم کی اچانک تبدیلی سے گھبرا کر جو ایئر کنڈیشنر آن کر دیا جائے تو چوں چوں کا طوفان آجاتا ہے۔ صبح اُٹھ کر دل اِتنا بُرا ہوتا ہے جب ٹوٹے ہوئے انڈے زمین پر بکھرے ہوتے ہیں۔ اِکادُکا پر اور ٹوٹا ہوا پنجہ کسی کے ہونے کی چغلی کھاتا ہے۔

میں ساری سردیاں سوٹی اُٹھا کر ان کے پیچھے پڑی رہتی ہوں۔ نوکروں سے بھی کہتی ہوں' ان کم بختوں کو کہیں گھونسلہ بنانے کی مہلت نہ دینا۔ مگر جب کبھی دو تین مہینے کے بعد کسی

چق کو گرایا، کسی روشن دان کو کھولا' اندر سے ان کے انڈے برآمد ہو گئے۔ اگر گھونسلہ گرا دیا جائے تو اپنے چڑے کو ساتھ ملا کر چوں چوں کا وِرد کرتی رہے گی اور منڈلاتی رہے گی اِدھر اُدھر' آگے پیچھے۔ ٹھیک ہے' میں بھی عورت ذات ہوں' اِس کا درد سمجھتی ہوں۔ اس کے انڈے ٹوٹ جائیں یا گھونسلہ بکھر جائے تو مجھے کم از کم چوبیس گھنٹے وہم سا رہتا ہے کہ جانے کیا ہو جائے' جانے بدُعا لگ جائے!

ساتھ ساتھ جل کر سوچتی ہوں کہ آخر اِسے سمجھ کیوں نہیں آتی کہ چق نے ایک دن کھلنا ہے' پنکھے نے ایک دن چلنا ہے اور پردوں کو ہلانے جلانے کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ایسی حماقتوں پر تو ترس کی کیفیت بھی زیادہ دیر نہیں رہ سکتی۔

ایک اور حماقت ملاحظہ ہو! انھیں کمروں میں گھسنے کا بہت شوق ہے۔ موسم بدلتے ہی ذرا کی ذرا دروازہ کھولیے' پُھر سے اُندر آ جائے گی۔ اندر تو مزے سے آ جائے گی مگر اسے باہر جانے کا راستہ کبھی نہیں ملے گا۔ آپ لاکھ کوشش کر کے دیکھ لیں' شی شی کریں' اف اف کریں' کپڑا لہرا لہرا کر رستہ دکھائیں' سامنے کھلا ہوا دروازہ اسے نظر نہیں آتا۔ بے تابانہ چکر لگائے گی۔ کبھی کھلی کھڑکی کے پٹ پر بیٹھے گی' کبھی چھت کے پنکھے کے ساتھ لٹکے گی' کبھی اِس دیوار پر بیٹھے گی' کبھی اُس دیوار پر۔ زیادہ اُڑائیں گے تو غسل خانے میں گھس جائے گی۔ پھر تقدیر ہی اس کو وہاں سے نکالے تو نکالے، آپ کبھی نہیں نکال سکتے۔ اگر رات بھر اندر رہے گی تو پھدک پھدک کر ہر چیز پر گلکاریاں کر دے گی۔

اتفاق سے اگر کمرے میں ڈریسنگ ٹیبل بھی پڑی ہے تو پھر اس کو باہر نکالنا ناممکن ترین بن جائے گا۔ اپنے عکس کو دوسری چڑیا سمجھ کے اس کے واری صدقے جائے گی۔ اس کو طرح طرح کے نغمے سنا کر بلائے گی۔ اگر اثر نہ ہو تو شیشے پر بیٹھ جائے گی اور اپنی ہم نشین کو چونچیں مارنا شروع کر دے گی۔ انجام کار خود ہی لہولہان ہو کر گر جائے گی۔ کیا اِس سے زیادہ بھی معصوم اور بھولی مخلوق کوئی دُنیا میں ہے؟ شاید نہیں ہے۔ جس کو شیشے میں اپنا عکس کسی دوسرے کا عکس لگتا ہو...... بے وقوف اور معصوم چہروں پر کسی کو ترس نہیں آتا' البتہ غصہ ضرور آتا ہے......

تھوڑی دیر پہلے میں نے اپنی اکلوتی بیٹی کا کمرہ کھلوایا تھا۔ شادی کے بعد وہ آسٹریلیا چلی گئی تھی۔ تین سال کے بعد وہ کل آ رہی ہے۔ اس کے ساتھ اس کا شوہر اور ایک سال کا بچہ بھی ہے۔ تین سال سے یہ کمرہ بند رہا۔ صبح میں نے کھول کر، ہوا لگوانے کی ٹھانی۔ ساری کھڑکیاں اور روشن دان بھی کھول دیئے۔ تھوڑی دیر بعد اندر آکر دیکھا۔ تو خیر سے ایک چڑیا اندر آچکی تھی۔ میں نے دروازے اچھی طرح سے کھول دیئے تاکہ خود ہی باہر نکل جائے۔

میں تھوڑی دیر کمرے میں بیٹھی۔ اس کو پُھدکتے ہوئے دیکھتی رہی۔ کمرہ تو میری پردیس میں رہنے والی بیٹی کا تھا۔ مگر وہ تو چہک چہک کر اور پُھدک پُھدک کر اس طرح اک اِک چیز سے آشنائی ظاہر کر رہی تھی جیسے مدتوں یہاں رہ چکی ہو۔ ویسے اس بار مجھے یقین تھا، اس نے یہاں آلنا نہیں بنایا ہوگا۔ ممکن ہے، گھونسلے کے لیے مناسب جگہ دیکھ رہی ہو، اُلو کہیں کی! میں نے صدر دروازہ کھول دیا اور خود باہر برآمدے میں چائے کی پیالی لے کر بیٹھ گئی تاکہ دھیان رکھوں کہ یہ اپنی پوری برادری کو اندر نہ بلا لے۔ میں باہر بیٹھی مزے مزے سے چائے پی رہی تھی کہ مجھے اچانک چاچا دلاور حسین کی باتیں یاد آنے لگیں۔

چاچا دلاور حسین کے پاس گھڑے گھڑائے محاورے، اور باموقع مفروضے ہوتے تھے، اِدھر آپ نے بات کی اُدھر اُنھوں نے بکچے میں سے واقعہ نکال لیا۔

ایک دن، میں گھر سے باہر نکل کر موٹر میں بیٹھ رہی تھی۔ کسی تقریب میں جانا تھا اور پہلے ہی تاخیر ہو گئی تھی۔ موٹر کا دراوزہ کھول کر بیٹھنے لگی تو گوشت کی ایک مکروہ سی بوٹی میرے پاؤں تلے آتے آتے بچ گئی۔

''یہ کیا ہے خدا بخش؟'' میں چیخ مار کے پرے ہٹ گئی۔

ڈرائیور دوڑا آیا۔ ''اوہو جی، یہ تو چڑیا کا بوٹ ہے۔''

''یہ کہاں سے آ گیا؟'' میں نے ناگواری سے کہا۔

اس نے بوٹ ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ بس اس کا ہاتھ میں بوٹ، پکڑنا تھا کہ جھلاتی ہوئی چڑیا چوں چوں کا غل مچاتی کہیں سے آگئی۔ ساتھ اس کا چڑا بھی مل گیا۔ دونوں

کی بے قراری کا عالم دیدنی تھا۔ اِدھر' اُدھر' شاخ پر' ڈال پر' دیوار پر' بیٹھتے اُڑتے...... اُڑتے بیٹھتے......

خدا بخش اُبھی پہلے بوٹ کو ہاتھ میں رکھے اِدھر اُدھر کوئی جگہ ڈھونڈھ رہا تھا کہ موٹر کے اگلے پہیے کے نیچے سے ایک اور بے بال و پر بچہ نکل آیا۔

''بیگم صاحب جی' یہ تو کسی نے اِن کا گھونسلہ گرادیا ہے۔ دیکھیں جی' تنکے بھی بکھرے پڑے ہیں۔''

شاید کسی نے شہتوت توڑنے کے لالچ میں ان کا گھونسلہ گرادیا تھا۔

''خدا بخش ان کو دیوار پر رکھ دو اور چلو مجھے دیر ہو رہی ہے۔''

''نہیں جی!'' خدا بخش نے دوسرا بچہ بھی اُٹھالیا۔ ''اِس طرح انھیں بلی کھا جائے گی' یا چیل جھپٹ لے گی۔''

مجھے غصہ آرہا تھا' اور وہ بڑے قرینے سے اُنھیں کسی شاخ پر بٹھانا چاہتا تھا۔

وہ شہتوت کی شاخوں کو ہلا جلا کر جگہ بنانے لگا۔ اِس پورے عرصے میں چڑی اور چڑا ایک رقصِ پریشاں کا مظاہرہ کرتے رہے۔ ان احمقوں کو یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ ان کے بچوں کے لیے ایک محفوظ مقام بنایا جارہا ہے۔

اتنے میں چاچا دلاور حسین آگئے۔ بولے۔ ''تناؤ میں لگتی ہو!''

''چاچا جی! اگر دُنیا میں چڑیاں نہ ہوتیں تو دُنیا میں کسی قسم کا تناؤ نہ ہوتا۔'' میں نے کہا۔

''او بھلیے لوکے! اس دُنیا کی ساری خوبصورتی کڑیوں اور چڑیوں ہی سے تو ہے۔''

''ہاں بھئی' کڑیوں کی بات تو سمجھ میں آتی ہے' یہ چڑیاں کس قطار میں ہیں؟ اچھا ہے جو گوجرنوالہ کے لوگ انھیں بھون کر کھا جاتے ہیں۔''

''کڑیئے! تو اپنے آرام دہ گھر سے باہر نکل...... کسی وِیران جگہ' کسی باغ یا صحن میں جا کر بیٹھ جا۔ جہاں کچھ بھی نہیں ہوگا' وہاں تجھے فضاؤں میں ہولے ہولے چوں چوں کی موسیقی سنائی دے گی۔ آسمان اور زمین کے درمیان اِنسانی رابطہ چڑیاں ہی تو ہیں۔''

''بس کریں چاچا جی!'' مجھے اَور بھی غصہ آ گیا۔'' پتہ نہیں ان کو پیدا کرنے کا مقصد کیا تھا؟''

''مقصد یہ تھا...... دُنیا میں ہمہ وقت ایک مدھ بھری موسیقی بجتی رہے...... صبح دوپہر شام۔ صبح اگر چڑیاں شور نہ مچائیں تو دُنیا بیدار نہ ہواَور شام کو اگر یہ اپنا آخری ترانہ نہ بجائیں تو لوگ اپنے گھروں کو نہ لوٹیں......''

مگر اس روز مَیں اپنی تقریب میں ایک گھنٹہ لیٹ ہوگئی، محض اس چڑیا کے بچوں کی حماقت کی وجہ سے!

چائے پی کر مَیں کمرے کے اندر گئی۔ وہ احمق چڑیا اَبھی تک اندر پھدک رہی تھی۔ میرا جی ہی تو جل گیا۔ اب میں اُسے جانے کا راستہ کیسے دکھاؤں......!

میں نے ملازم کو آواز دی۔''اسلم ذرا وہ جالے اُتارنے والا بانس لیتے آنا۔ اَور آ کر اس منحوس کو باہر نکالو!''

پتہ نہیں اسلم نے میری آواز سنی یا نہیں...... آج کل نوکر بھی بڑے من موجی ہو گئے ہیں۔ کام کرنے کو دل نہ چاہے تو صاف کہہ دیتے ہیں''میں نے سُنا نہیں تھا''۔

میں دوبارہ کمرے کے اَندر آ گئی۔

بیلا میری اکلوتی بیٹی ہے۔ ابھی بی اے کا امتحان نہیں دیا تھا کہ ایک بہت اچھا رشتہ آ گیا۔ وہ چیختی چلاتی رہی، میں نے اس کی شادی کر دی۔ شادی کے بعد وہ آسٹریلیا چلی گئی تھی۔ وہیں اس کا بیٹا پیدا ہوا۔ ٹیلی فون پر خوب لمبی بات بھی کر لیتی تھی۔ مگر اب وہ پاکستان آ رہی تھی۔ میں اس کا کمرہ بڑی خوبصورتی سے سجانا چاہتی تھی۔ اس کی چیزیں کمرے کے اندر ویسی ہی رکھی تھیں۔ اس کو جگہ جگہ کی گڑیاں اکٹھی کرنے کا بہت شوق تھا۔ میں بھی ساری چیزیں جھاڑ پونچھ کے ویسے ہی سجا دینا چاہتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ جب بیٹی سسرال سے ماں کے گھر آتی ہے تو پہلے والا پیار اور پہلے والی مراعات چاہتی ہے۔ تھوڑی سی بے پرواہی ہو جائے تو فٹ کہتی ہے''آپ نے مجھے مصیبت سمجھ لیا ہے''۔

ٹک...... کوئی شے گری...... میں نے چونک کر دیکھا، کم بخت چڑیا کا کارنامہ تھا۔ اب گھٹیا حرکتوں پر اُتر آئی تھی۔ عین بیلا کی گڑیا کے سر کے اُوپر بیٹ گری تھی۔

میرا خون کھول گیا۔ بازو پھیلا کر چڑیا کو اڑاتے اُڑاتے سامنے والے دروازے کے آگے پہنچی تو ایک اُور دروازہ کھل گیا۔

امی دروازے میں کھڑی تھیں اور کہہ رہی تھیں: ''آپے پھاتڑیئے' تینوں کون چھڑائے گا۔''

(ترجمہ: ازخودگرفتار ہونے والی تجھے کوئی نہیں چھڑائے گا)

جب میں نے شادی کا فیصلہ کرلیا تھا تو ماں نے بس مجھے اتنا کہا تھا۔ ماں ہمیشہ بیٹی کو صحیح راستہ دکھانے کی کوشش کرتی ہے۔ ماں کہتی ہے کہ جہاں عزتِ نفس کا سودا نہ ہو' زندگی وہاں گزارنی چاہیے اُور میں کہتی' محبت اور عزتِ نفس ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک کی موجودگی میں دوسری کیسے رہے؟'' تبھی تو چار بچوں کے باپ سے میں نے شادی کرلی...... یہ صرف کتابی بات تھی کہ تھکا رہارا مرد' تازہ گلاب سے پیار کرتا ہے۔

مڑ کر دیکھا تو دوسرے دروازے میں میری ساس کھڑی تھی۔ غضبناک نگاہوں سے شعلے برساتی ہوئی بولی: ''جو اپنی مرضی سے آجاتی ہیں' اُنھیں ہماری مرضی کے مطابق رہنا پڑتا ہے۔''

تیسرا دروازہ کھلا تو اس میں میرا شوہر کھڑا تھا۔ کہنے لگا: ''یہ بندوبست اگر تمھیں پسند نہیں تو جا سکتی ہو۔ میں نے تو تمھیں بتا دیا تھا' میری ماں میرے ساتھ رہے گی اور میرے بال بچے بھی۔''

''ٹھیک ہے میں چلی جاؤں گی''...... میں نے قوتِ ارادی کو مجتمع کر کے کہا۔

اس نے کمرے کا دراوزہ کھول کر مجھے باہر دھکا دے دیا۔

مجھے اپنی نومولو بیٹی کا خیال آ گیا۔ میں دوڑ کر اِس کے کمرے میں گئی۔ وہ پنگھوڑے میں سو رہی تھی...... میرے اپنے وجود کا ایک ٹکڑا' خوشبو سے مہکتا اُور محبتوں سے چھلکتا۔ میں اس پر جھک گئی۔ میرا ایک آنسو اُس کے رخسار پر گرا۔ اس نے منہ بسورا...... جیسے کہہ رہی ہو:

''ماں'' ماں! یہ دُنیا ایسی تھی تو تُو مجھے دُنیا میں لائی کیوں تھی۔ اگر تجھے تحفظ نہ مل سکا تو مجھے کیسے تحفظ دے گی۔ ماں تیرا کوئی ٹھکانہ نہ ہوا تو میں کہاں ٹھکانہ کرونگی۔ اس سے اچھا نہ تھا کہ تو مجھے اپنی کوکھ میں چھپائے رکھتی!''

میں نے جھک کر اس کا رخسار چوم لیا۔

وہ بسورتے بسورتے مسکرا دی۔ جیسے مجھے پیغام دے رہی ہو: ''ماں! جنم دیا ہے تو پھر حوصلہ بھی رکھو! دُنیا میں ایک ہی رشتہ تو سچا ہے...... ماں اور بچے کا۔''

یہی رشتہ عورت کو سہاگن اور بھاگن کرتا ہے...... میں نے بیلا کو اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ اس کی معصوم مسکراہٹ نے مجھے ایک نیا رستہ دکھایا تھا۔

پھر تو اُس گھر کے دروازے کئی بار کھلے۔ کئی بار اذنِ رخصت ملا۔ کئی بار میری اَنا کو قدموں تلے روندا گیا۔ مگر میں آشیانہ چھوڑ دیتی تو میری اولاد کس کے در پر جاتی!

دروازے کھول دینا تو بہت آسان ہے۔ دروازے کے باہر قدم رکھنا بہت مشکل ہے۔

آج میری ساس بھی زندہ نہیں، میرا شوہر بھی حیات نہیں مگر یہ گھر میرا ہے...... یہ گھر جس سے پرواز کر جانے کا حکم بار ہا ملا اور جس کے کھلے دروازوں کی دہلیز نے ہمیشہ میرے قدموں کو پکڑے رکھا۔

☆☆☆

''آئیں بیگم صاحب جی! اسلم بانس اُٹھائے ہانپتا کانپتا آ گیا۔ آج میں اس چڑیا کا ایسا کچومر نکالوں گا کہ دوبارہ اس طرف آنے کے قابل نہ رہے گی۔''

''نہیں اسلم'' ...... میں نے بانس پکڑ کے اُسے روک دیا...... ''اسے نکالنے کی ضرورت نہیں میں نے سوچ لیا ہے، چھوٹی بی بی کے لیے میں اپنا کمرہ ٹھیک کرونگی، جاؤ تم کمرے کا سارا سامان باہر نکالو!''

نوکر اُدھر چلا گیا تو میں آ کر بیلا کے بستر پر بیٹھ گئی۔ ایسے محسوس ہوا، پچیس برس کی تھکاوٹ اعصاب پر حاوی ہوگئی ہے۔

☆☆☆

ایک دن بیلا نے سکول سے آ کر کہا......"ماں ان لڑکیوں کی کوئی عزت نہیں ہوتی' جن کی ماں طلاق لے کر آ جاتی ہے۔"

"تم سے کس نے یہ بات کہی؟" میں نے پوچھا۔

بولی: "ہمارے سکول میں ہے ایک لڑکی......اس کی ماں اس کے باپ سے لڑ کر آ گئی تھی۔ اس میں لڑکی کا کیا قصور ہے؟"

"یہ تو ماں کو سوچنا چاہیے تھا۔"

"اب اس کی ماں اپنے بھائی کے گھر میں رہتی ہے، جہاں اس کی بیٹی کی کوئی عزت نہیں۔ ماں! تم نے بہت اچھا کیا، میرے بابا کو نہیں چھوڑا۔ بیٹی کو ایک گھر کی ضرورت ہوتی ہے......ایسا گھر جس کے اندر سے وہ باہر نکلے تو لوگ اُسے عزت کی نگاہ سے دیکھیں۔" میں جی جان سے لرز گئی۔

آخری دنوں میں میرے شوہر بیلا پر جان چھڑکنے لگے تھے۔ اس کی کوئی فرمائش ٹالتے نہیں تھے۔ یہ وہ شخص تھا جس نے کبھی میری کوئی بات سنی ہی نہ تھی۔

بیلا کو باپ کی شفقت اور گھر کی عافیت درکار تھی......ایک گھر جس کی لامتناہی قیمتیں ادا کرتے کرتے عورت تمام ہو جاتی ہے۔ ساری زندگی اپنی جانِ ناتواں سے اُس کا ٹیکس ادا کرتی رہتی ہے......اک اک سانس کے ساتھ قیمت چکاتی ہے۔

اپنی قوتِ برداشت اور اپنی قوتِ مدافعت پر سوئی ہوئی حیرتیں یکلخت جاگ اُٹھیں۔ ان کے پیچھے قطار اندر قطار ایسے کانٹے تھے' جو رُوح میں چبھے ہوئے تھے......یہ تو ایک ٹیکس زدہ زندگی ہے......

گھر گھر کرتے عورت مٹی میں مل جاتی ہے......

☆☆☆

کل ایک سیمینار کے دوران ایک عورت نے اُٹھ کر صاحبِ صدر سے بڑا عجیب سا

سوال کر دیا۔ ایک ماہرِ نفسیات حضرت امریکا سے آئے ہوئے تھے۔ لیڈیز کلب نے اُنھیں لیکچر دینے کے لیے بلا لیا۔ میں بھی رکن کی حیثیت سے وہاں گئی تھی۔ وہ میاں بیوی کے رشتے پر خوب پُر اثر لیکچر دے چکے تو سوالات کرنے کی اجازت دی۔

مسز متین کھڑی ہو گئیں، اور بولیں: ''ڈاکٹر صاحب! یہ تو بتائیں! عورت کا اصلی گھر کونسا ہوتا ہے!''

ڈاکٹر صاحب نہیں سمجھے۔ تو وہ پھر بولیں: ''جب ماں باپ کے گھر ہوتی ہے تو وہ ہر وقت کہتے ہیں، جب اپنے گھر جاؤ گی تو یہ سب کر لینا' اپنے گھر جاؤ گی تو پتہ چلے گا۔ سو وہ لاشعوری طور پر سمجھنے لگ جاتی ہے کہ شوہر کا گھر ہی اس کا اصلی گھر ہو گا۔ جب شوہر کے گھر آتی ہے تو ساس کہتی ہے، یہ میرا گھر ہے۔ میں نے برسوں میں اُسے بنایا ہے۔ تو میرے بعد اس گھر کی مالکن ہو گی۔ ساس مر جاتی ہے۔ بچے جوان ہو جاتے ہیں۔ تو ایک دن بہو آ جاتی ہے۔ وہ کہتی ہے، بہت عیش کر لیا تم نے...... اب یہ گھر میرا ہے۔ یوں بھی پوری زندگی جب بھی شوہر کو غصہ آئے تو فوراً کہتا ہے: نکل جاؤ میرے گھر سے...... تو پھر عورت کا گھر کونسا ہوتا ہے......؟''

ڈاکٹر صاحب جیسے مراقبے میں چلے گئے تھوڑی دیر حیرت سے مسز متین کو دیکھتے رہے۔ عورتیں کھسر پھسر کرتی رہیں۔ شاید سبھی کے دل اس سوال کے جواب کے تمنائی تھے پھر ڈاکٹر صاحب مسکرا کر بولے:

''واقعی! ان خطوط پر تو ہم نے کبھی سوچا ہی نہیں۔''

لیجیے سیمینار کامیابی سے ختم ہوا۔ ہر عورت سوال کا بھاری پتھر کلیجے پر لیے چل دی' سارے گھر عورتوں کی وجہ سے آباد ہیں۔

عورتیں ایک تسلسل ہیں، ایک رابطہ ہیں...... حیات اور کائنات کا' زمین اور آسمان کے اندر...... جیسے ہر دم چوں چوں کا ساز بجانے والی چڑیاں...... فقط ایک گھونسلے کے لیے ہر دم جگہ ڈھونڈتی رہتی ہیں اور اکثر غلط جگہ پہ گھونسلہ بنا لیتی ہیں...... بچا لیں تو بھی چلاتی ہیں...... نہ بچا سکیں تو بھی شور مچاتی ہیں......

فقط ایک شیر کے لیے پورے عیسیاں کو آگ لگانی پڑتی ہے۔
اچانک میری نظر سامنے کی دیوار پر اُٹھ گئی...... وہ ننھی سی جان سہمی اور سمٹی ہوئی بہت حیران صورت بنا کر بہت اضطرابی کیفیت میں میرے بے اختیار بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ رہی تھی!

☆☆☆

باسی پھُول

ان دونوں کی محبت جب عروج پر پہنچی تو ان دونوں کے والدین میں ٹھن گئی۔ ماموں پھوپھی کے رشتے بڑے قریبی ہوتے ہیں مگر جب ناچاقی ہو جائے تو میلوں کی دُوریاں درمیان میں آجاتی ہیں۔ محبت کرنے والے کتنا بھی احتجاج کریں، خون کے رشتے کی ٹوٹی ہوئی ڈوریاں نہیں جوڑ سکتے۔ بعد از بسیار خرابی و الزام تراشی مرغوب احمد کے والدین نے فوراً اِس کا رشتہ طے کر دیا بلکہ شادی کی تاریخ بھی مقرر کر دی۔

ماہ نور کے وال[illegible]ن کے لیے یہ ایک چیلنج ثابت ہوا۔ اُنھوں نے بھی رشتے کی تلاش شروع کر دی۔ اور ایک [illegible]ز کا رشتہ قبول بھی کر لیا۔

دونوں خاند[illegible]ن [illegible] بیچ میں نفرت کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

محبت کی لہر جتنا بھی بلند ہوتی، منہ کی کھا کر واپس لوٹ آتی۔ دونوں گھروں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ کان بند کر لیے تھے۔ مگر زبان کو کھلا چھوڑ دیا تھا۔ زبان کے گھاؤ اپنا کام کر گئے۔

ماہ نور کی بھی شادی ہو گئی۔

بارات ایک دُور دراز کے گاؤں سے آئی تھی۔ بڑا خاندان تھا۔ بڑا نام تھا۔ اپنی حیثیت کا اُنھوں نے جی بھر کر مظاہرہ کیا۔ ماہ نور کے والدین بھی یہی چاہتے تھے۔

رات کا پورا سفر ٹرین میں کٹا اور جب پو پھٹ رہی تھی ان کا سٹیشن آگیا۔ مگر وہاں سے اُنھیں آگے اپنی موٹروں پر جانا تھا۔ ایک سو کلومیٹر کا سفر کاروں کے کارواں میں طے ہوا۔ گاؤں پہنچنے تک سب ہی بیدم ہو چکے تھے۔ اس لیے دلہن کو بطور خاص آرام کرنے کا موقع

دیا گیا۔ دن بھر سب لوگ سوتے رہے اور وہ بھی سوتی رہی۔ دوسری رات جو کہ اس کی پہلی رات تھی' اسے پھر سے دلہن بنایا گیا۔ زیور کپڑوں سے سجایا گیا۔ سلامیاں ہوئیں' رونقیں لگیں' ضیافتیں اُڑائی گئیں...... اور رات گئے اس کو حجلۂ عروسی میں پہنچا دیا گیا۔

کڑی منزل کا وہ لمحہ آ پہنچا' جس کے لیے وہ بہت کنفیوز ہو رہی تھی۔ شادی سے انکار کی اس میں ہمت نہیں تھی اور وہ بدبخت جو دس سال سے چوری چھپے اس سے محبت کر رہا تھا' اس سے بھی پہلے شادی رچا بیٹھا تھا' نہ وہ اسے مل سکی' نہ طعنے دے کر اس کا جگر زخمی کر سکی۔ غصہ ہو یا انتقام' پھر بھی محبوب کی جگہ پر محبوب ہی رہتا ہے۔ اتنی جلدی تو فریم میں تصویر بھی نہیں بدلی جا سکتی' جتنی جلدی اسے ایک اجنبی کو قبول کرنا پڑ گیا تھا۔

وسوسوں میں گھری بیٹھی تھی کہ دولہا اندر آ گیا۔

اس نے خود ہی نظر اُٹھا کر دیکھ لیا۔ بہت خوبرو نوجوان تھا۔ شادی کی تقریبات میں وہ نظر جما کے دیکھ نہ پائی تھی۔ اُونچا لمبا...... رنگ گورا...... بال گھنیرے...... سراپا صحت مند...... اچکن اور چوڑی دار پاجامے میں اور بھی جچ رہا تھا۔

ماہ نور نے نظر بھر کر اس کا پورا سراپا دیکھا' اور پھر نظر جھکا لی۔ یہ سوچتے ہوئے کہ اگر وہ دس سال سے مرغوب کی محبت میں نہ جی رہی ہوتی تو اس خوش جمال کو دیکھ کر نہال ہو جاتی۔

دولہا نے اپنی اچکن اُتار کے الگنی پر لٹکا دی اور آ کر پلنگ پر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ ماہ نور کے اندر کوئی ہیجان برپا نہیں تھا۔ پھر بھی وہ سوچ رہی تھی کہ زندگی کا ڈرامائی دور اب شروع ہو گا۔

دولہا تھوڑی دیر چپ بیٹھا رہا۔ اپنی بھری بھری صحت مند انگلیوں سے کھیلتا رہا...... پھر گلا کھنکار کر بولا: ''میں نے ابھی آپ کو دیکھا ہے۔ آپ انتہائی خوبصورت لڑکی ہیں اور یہ تو مجھے پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہیں۔ میں آپ جیسی لڑکی کو کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔

اب پہلی دفعہ ماہ نور کا دل دھڑک کر حلق تک آ گیا...... شاید وہ بھی اسی کی طرح محبت کا

زخم خوردہ تھا اور تقدیر کی ستم رانی کا قصہ بیان کرنا چاہتا تھا۔

انتظار کرنے لگی......

وہ پھر چپ ہو گیا، جیسے کشمکش میں مبتلا ہے۔ بتائے یا نہ بتائے......

میں اسے دِل سے معاف کر دوں گی۔ ماہ نور نے جلدی جلدی سوچا۔

اس نے پھر گلا صاف کیا' جیسے۔ گلے میں پھنسی ہوئی کوئی بات نکالنا چاہتا ہے۔ اور جلدی سے بولا: ''میں شادی کے اہل نہیں تھا۔ یہ حادثہ میری زندگی میں ہوا۔ میں نے گھر والوں کو طرح طرح سے سمجھایا کہ وہ میری شادی نہ کریں مگر اُنھوں نے میری ایک نہ سنی۔''

اب اس نے آنکھیں جھکا لیں' کہنے لگا: ''میں اپنی پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی ہوں' اور پانچ بہنیں اپنے اکلوتے بھائی کی بے بسی تک نہیں پہنچ سکتیں۔ میں کئی کئی مہینے ملک سے باہر چلا جاتا تھا...... گھر نہیں آتا تھا...... مگر...... آپ سمجھ رہی ہیں نا؟ بالآخر اکلوتے بھائی کے سر پر سہرا دیکھنے کی دھن میں اُنھوں نے کسی معصوم لڑکی کی زندگی تباہ کر دی......!''

اس فقرے پر ماہ نور بے ساختہ رونے لگی۔ پتہ نہیں آنسو کہاں بیٹھے ہوئے تھے اور کس بات پر نکل رہے تھے۔ جبکہ ٹرین کے پورے سفر میں وہ روتی آئی تھی۔

وہ پھر بولنے لگا...... ''میری بہنوں کا ارمان ہے کہ پرکھوں کی یہ حویلی آباد ہو جائے۔ سارا گاؤں جی بھر کر جشن منالے کہ خان زادہ برہان الدین کے اکلوتے بیٹے کی خانہ آبادی ہو گئی ہے۔''

یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے مسہری کے پھولوں کو ہلایا جلایا۔ اور آگے بڑھ کر ایئر کنڈیشنر کو ذرا تیز کر دیا۔ غالباً اسے پسینہ آ رہا تھا۔

ماہ نور برابر روتی رہی۔ نتھ کے ہالے میں پھنسے ہوئے اپنے آنسو خود ہی پونچھتی رہی۔

رات نوحہ کرتی گزرتی رہی......

یونہی کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہل کے وہ بے معنی سے کام کرتا رہا۔

جب وہ بہت زیادہ رو چکی تو پھر آ کر اس کے پاس بیٹھ گیا اور آواز میں خجالت کے ساتھ

نرمی سمو کر بولا: ''پتہ نہیں کیوں آپ کی صورت دیکھتے ہی میں نے فیصلہ کیا کہ آپ کو دھوکے میں نہیں رکھوں گا۔ ورنہ یہ معاملہ کسی نہ کسی طرح لٹکایا جاسکتا تھا۔ آپ فکر نہ کریں۔ اور غمزدہ بھی نہ ہوں! جب رسم و رواج کی یہ گرد بیٹھ جائے گی' اور میری بہنوں کا چاؤ پورا ہو جائے گا تو میں...... ''وہ خاموش ہو گیا۔

اب ماہ نور نے اپنی آنکھیں اچھی طرح صاف کر لیں تھیں۔ دھلی دھلائی مغموم آنکھیں اُٹھا کر استفہامیہ انداز میں اس کو دیکھنے لگی۔

وہ بھی اس کے چہرے پر نظر جما کے بولا: ''آپ جس طرح کہیں گی، میں اسی طرح کروں گا۔ آپ میرے ساتھ رہنا چاہیں یا طلاق لینا چاہیں یا کسی اور سے وابستہ ہونا چاہیں...... سب آپ کی صوابدید پر ہوگا۔''

ارے......؟ ماہ نور کی آنکھوں کا گیلا کاجل حیرت سے اور پھیل گیا۔ قسمت یوں بھی مہربان ہو سکتی تھی۔ کاش' اس کا محبوب بے وفا نہ ہوتا......!

مگر وہ اسے کشمکش میں دیکھ کر بولا: ''میری ایک شرط ہے''...... یہ کہتے ہوئے اس کے ماتھے پر پسینہ آگیا۔

''شرط......؟'' ماہ نور کے صرف ہونٹ ہلے' یوں لگا اس کی آواز گلے میں پھنسی رہ گئی۔

''میری ساری برادری جمع ہے اور اس وقت میری عزت رکھنا آپ کا کام ہے۔ میری ہی نہیں' میرے خاندان اور میری بہنوں کی عزت کا بھرم آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ کل طلوع ہونے والی صبح ہمیں ذلت میں بھی اُتار سکتی ہے' اور عزت بھی بخش سکتی ہے۔ آپ کی آنکھوں سے پتہ چلتا ہے آپ بہت ذہین ہیں اور میری بات بخوبی سمجھ رہی ہیں بلکہ اِس کی گہرائی میں اُتر سکتی ہیں۔''

یک لخت ماہ نور کی آنکھوں سے چھاجوں مینہ برسنے لگا...... ایسی بوچھاڑ آئی کہ وہ باقاعدہ سسکنے لگی۔ ظالم نے کیسا نرم گوشہ تلاش کیا تھا!

وہ اسے دیکھ رہا...... پھر بولا: ''میں آپ کی جگہ ہوتا تو میری بھی یہی کیفیت ہوتی۔ لیکن

پلیز جب تک آپ زبان سے اقرار نہ کریں، مجھے کیسے پتہ چلے گا کہ آپ کو زندگی کا یہ نیا کنٹریکٹ قبول ہے!

روتے روتے اس نے سر اُٹھایا۔ پھر اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اپنے جواب کا منتظر رہا...... تو وہ گلا کھنگار کر بولی: ''قبول ہے......'' لیکن اس قبول ہے میں اور نکاح والے قبول ہے میں زمین آسمان کا فرق تھا!

یوں اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔ شادی کے وقت اس نے اپنی ماں سے کہہ دیا تھا کہ جس طرح اسے بدہضمی کا نوالہ بنا کر دُور دراز پھینکا جا رہا ہے، وہ کبھی میکے نہ آئے گی۔ اب احتجاج کرتی بھی تو کس کے لیے!

گو وہ مرغوب احمد سے خفا تھی۔ مگر اس کی محبت کو دل سے نہ کھرچ سکی تھی۔ یہ عجیب معاملہ تھا، ایک طرف غصہ اُور اِنتقام اور دوسری طرف محبت ہی محبت۔

وہ کب خوشی اور سرخوشی کے ساتھ اپنا وجود جبران کے حوالے کرنے پر راضی تھی۔ ایک معقول عذر اپنے آپ بن گیا تھا۔ اس نے جبران کو ممنون کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اور ایک کامیاب سہاگن کا ایسا ڈرامہ رچایا کہ پوری حویلی اس کی گرویدہ ہوگئی۔ اندر باہر اس کے حسنِ سلوک کا ڈنکا بجنے لگا۔ جبران خان سے اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ اپنی شرائط پر اس کے ساتھ اِسی حویلی میں رہے گی۔

کرنا خدا کا یوں ہوا کہ اگلے سال اس گاؤں میں لڑکیوں کا ایک کالج کھل گیا۔ ماہ نور نے جبران خان سے کہا کہ اپنے خاندان کی روایات کے برعکس اسے کالج میں پڑھانے کی اجازت دی جائے۔ اس کی بہنوں نے سنا تو چیختی چلاتی آگئیں۔ بزرگ بھی دوڑے آئے۔ مگر جبران خان ڈھال بن گیا، اور ماہ نور کے شب و روز مقصدی ہو گئے۔

☆☆☆

اس نے لڑکیوں کے کالج کو ڈگری کالج بنوایا۔ نئے مضامین کے شعبے بنوائے۔ کالج کو ارتقا پر پہنچایا گاؤں کی زندگی میں ایک نئی لہر دوڑا دی۔

کوئی اور مشغلہ تھا بھی نہیں اس کا۔ دس سال وہ اپنے میکے نہیں گئی۔ ہاں میکے والے گاہے بگاہے اسے ملنے آتے رہے۔ شکوے شکایات ہوتے رہے۔ وہ بھی سلیقہ مندی سے وقت گزارتی رہی۔ دس سال بعد اِس کی بہترین کارکردگی کے عوض اسے پرنسپل بنادیا گیا۔

انہی دنوں اسے اپنے والد کی فوتیدگی کی اطلاع ملی۔ یہ ایسا موقع تھا کہ وہ اپنی قسم پر قائم نہ رہ سکی اور شہر چلی گئی۔

دس سالوں میں وہاں ایسی تبدیلیاں آچکی تھیں جن کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ یعنی اس کی ایک بھتیجی کی شادی مرغوب احمد کے چھوٹے بھائی مطلوب احمد سے ہوچکی تھی اور مرغوب احمد کی بیوی مہوش کی چھوٹی بہن کی شادی ماہ نور کے چھوٹے بھائی فضیل سے ہوگئی تھی۔ اب دونوں خاندان آپس میں یوں شیر وشکر تھے جیسے کہ شکر رنجی کبھی ہوئی نہ تھی۔ ایک دوسرے کے بغیر ان دونوں خاندانوں کا کوئی پل نہیں گزرتا تھا۔ کیا ساری مصیبتیں اور بندشیں بس اسی کے لیے تھیں۔ وہ خاندان سے نکل گئی تو سب ایک دوسرے کے ہوگئے۔

وہ جب سے آئی تھی، ہر موقعے پر مرغوب کو گھر کے اندر آتا اور جاتا دیکھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ بھی صاحب سلامت ہوئی۔ مرغوب کی بیوی سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ اس کے چار بچے تھے اور پھول کر کپا ہوگئی تھی۔

یہ کس قسم کا خاندانی نظام ہے...... ایک شام وہ برآمدے کے ستون کے ساتھ لگی سوچ رہی تھی۔ جب اس کی اور مرغوب کی شادی کا معاملہ زیرِ غور آیا تو سب ایک دوسرے کے جانی دشمن ہوگئے۔ اور جب وہ یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلی گئی۔ تو ماں نے بھی اپنے بھائی کو گلے لگا لیا اور سب لوگوں نے رشتے داریاں بھی دوہری کرلیں...... کیا سب کو اُسی سے بیر تھا؟

وہ آنکھوں میں آنسو لیے کھڑی تھی کہ مرغوب آگیا۔ اسے تنہا دیکھ کر اس کے قریب آیا۔ قریب آتے ہی یوں لگا' اس کی آنکھوں میں پرانی قربتوں کے چراغ جلنے لگے ہیں۔ کہنے لگا: ''نور! تم تو ویسی کی ویسی ہو۔ ان دس سالوں نے تمھارا کچھ نہیں بگاڑا۔ بلکہ سچ کہوں تو پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت ہوگئی ہو۔''

ماہ نور نے اپنی آنکھوں میں آئے آنسو پی لیے اور کچھ نہیں کہا۔ بھلا اس بات کا کیا جواب ہو سکتا تھا۔

پھر خود ہی بولا: ''کیسا ہے تمھارا شوہر؟ لگتا ہے' اس نے تمھیں بہت آسودہ رکھا ہے۔''

ماہ نور نے بس اتنا کہا: ''میرے شوہر بہت اچھے ہیں۔''

''سنا ہے تم کالج میں پڑھاتی ہو۔''

''ٹھیک سنا ہے تم نے......''

''اور بچے......؟'' وہ بولا...... ''تمھارے بچے......؟''

''ابھی میں ان کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔''

''بچے بہت بڑی حقیقت ہیں نور! ہر غم کو بھلا دیتے ہیں۔''

وہ سوگواری سے ہنسی...... ''مجھے کوئی غم نہیں ہے۔''

اتنے میں کچھ لوگ آگئے۔ اور اُن کی گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

پھر یوں ہونے لگا کہ ہر روز وہ اس سے بات کرنے کا موقع تلاش کر ہی لیتا۔ اور ہر روز کوئی ایسی بات کہہ دیتا جیسے اس کے دل کو کریدنا چاہتا ہو۔

ماہ نور دس سالوں کے بعد میکے آئی تھی۔ اس لیے اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ابا کے چالیسویں تک یہیں رہے گی۔ سب گھر والے یہ سن کر بہت خوش ہوئے۔ خوش ہونے والوں میں پیش پیش مرغوب کی بیوی مہوش تھی۔ ہر ہفتے سارا خاندان اکٹھا ہوتا۔ یوں بھی تعزیت کے لیے لوگ آئے رہتے اور اتنے عرصے کے بعد سب سے مل کر ماہ نور کا دل خوش ہو جاتا۔ پھر یوں ہونے لگا کہ ماہ نور کو شاپنگ کے لیے بازار جانا ہوتا۔ گاؤں کے عزیزوں کے لیے وہ جاتے ہوئے تحفے تحائف لے کے جانا چاہتی تھی۔ روزانہ کوئی نہ کوئی اُسے بازار لے جاتا۔ مہوش خود موٹر چلا لیتی تھی۔ وہ یہ خدمت سرانجام دینے کو ہمیشہ تیار رہتی۔ رفتہ رفتہ سب کا جوش خروش ٹھنڈا ہو گیا یا پھر مہوش کو اس کی طرف سے کوئی کھٹکا نہ رہا۔ اس کی خاموش طبیعت نے سب کو گرویدہ بنا لیا۔ آخری ہفتے میں مرغوب سرِ عام اسے بازار لے جاتا۔ اور اس کے چھوٹے موٹے کام کروا

دیتا۔ اس کے ساتھ گھومتے پھرتے ہوئے وہ ان جگہوں اور ریستورانوں کا ذکر کرنے لگے جہاں جہاں وہ یونیورسٹی کے زمانے میں ملا کرتے تھے۔ پھر وہ ان جگہوں کو دیکھنے لگے...... پرانی باتیں دہرانے لگے...... ہنس ہنس کے اپنے زخم کریدنے لگے۔

جب ایک دن مرغوب احمد نے اسے بتایا کہ وہ شادی پر بالکل رضامند نہیں تھا مگر ماں نے اس کا ہاتھ اپنے سر پر رکھ کر اُسے قسم دے دی تھی۔ اس کے باوجود اس نے ایک رات زیادہ تعداد میں نیند کی گولیاں کھالی تھیں۔ اسے فوراً بچا لیا گیا' اور اس بات پر پردہ بھی ڈالا گیا۔

جوں جوں وہ اسے اپنی بے بسی اور بیگناہی کے قصے سناتا' اس کے دل کا بوجھ کم ہوتا جاتا۔ وہ جب ماہ نور کے قریب ہوتا تو اسے ویسی ہی نظروں سے دیکھتا جیسے محبت کرنے کے زمانے میں دیکھا کرتا تھا اُسی لب و لہجے میں باتیں کرتا۔ اُسی طرح اس کے حسن کی تعریفیں کرتا۔ اس کے کورے بدن میں چنگاریاں سی جاگنے لگتیں۔ اس کی ساری محرومیاں واویلا کرنے لگتیں۔ اسے اپنی زندگی کے ضائع ہونے کا دُکھ ستانے لگتا۔ وہ اپنے آپ کو دُنیا کی احمق ترین عورت سمجھنے لگتی۔

ایک دن جب وہ کسی پرانے ریستوان میں بیٹھے سہانے ماضی کی باتیں کر رہے تھے تو ماہ نور سے اپنی شکستہ ذات کا چھلکتا ساغر سنبھالا نہ گیا اور اس نے اپنی محرومیوں کی ساری داستان مرغوب کو سنا دی...... اور یہ بھی بتا دیا کہ چونکہ وہ اس کے سوا کسی اور کی بیاہتا نہیں بننا چاہتی تھی' اس لیے اس نے جبران خان کے ساتھ یہ سودا منظور کر لیا ہے۔

مرغوب نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور ان پر اپنی آنکھیں رکھ کر کتنی دیر تک روتا رہا......

نہ جانے کیوں...... مرغوب کو اپنی زندگی کا دُکھ بتا کر اسے سکون ملا۔ اور تو سارے گھر میں وہ کسی کو اپنے غم میں شریک نہ کر سکتی تھی۔ سب ہی اسے بڑے گھر کی بہو سمجھتے تھے اور اس کی قسمت پر رشک کرتے تھے۔

جب وہ واپس جانے کی تیاری کر رہی تھی، مرغوب نے چپکے سے آ کے کہا: ''نور ابھی

مت جاؤ...... مجھے یوں لگ رہا ہے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ میرا خواب ٹوٹ جائے گا۔"

ماہ نور کو یوں محسوس ہوا، جیسے دھواں دار برسات کے بعد کسی منہ زور چشمے کا دہانہ آپ ہی آپ کھل گیا ہے...... عشق کے دہکتے ہوئے کوئلے کو اُس نے اب تک بھوسے تلے دبا رکھا تھا۔ اب تو سارا بھوسہ لَو دے رہا ہے اور دھواں باہر نکلنے کو ہے...... خوف کے مارے وہ جلدی سے سسرال آ گئی اور اپنے کام میں مگن ہو گئی۔

ایک دن رات گئے جبران خان اس کے کمرے میں آیا اور بولا: "ماہ نور! تم مجھے خود ہی بتا دوگی یا میں ہی پوچھ لوں؟"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی...... ماہ نور نے کہا۔

وہ ہنس پڑا...... "مجھے ہی پوچھنا پڑے گا۔ تم دس سال تک میکے نہیں گئیں۔ میں نے اس کی وجہ نہیں پوچھی۔ اب جب تم اتنے عرصے بعد گئی ہو تو واپسی پر تم پہلے جیسی نہیں ہو۔"

ماہ نور کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔

"کیا کچھ الٹی سیدھی حرکت ہو گئی مجھ سے......؟" خوف زدہ انداز میں پوچھنے لگی۔

"نہیں...... میں دس سال سے تمھیں دیکھ رہا ہوں۔ پہلے تمھارا چہرہ سنسان اور پُرسکون رہا کرتا تھا۔ شہر سے آنے کے بعد تمھارا چہرہ سلگ رہا ہے اور سوچ میں گم ہے۔ ہمارا تمھارا کنٹریکٹ ہے، یہ مت بھولو! اگر کوئی بات ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں اپنا وعدہ پورا کروں گا۔"

ماہ نور بے اختیار ہو کر رونے لگی جیسے پہلی رات رونے لگی تھی۔

وہ اسے چپ چاپ دیکھتا رہا...... اور اِنتظار کرتا رہا......

تھوڑی دیر رو کر ماہ نور پُرسکون ہو گئی۔ پھر اس نے اپنی اور مرغوب کی ساری کہانی جبران خان کو سنا دی۔

"تمھیں تمھارے صبر کا اَجر تو ملنا چاہیے ماہ نور!"

"کیا زندگی کا پہیہ اُلٹا گھوم سکتا ہے؟"......

"ہاں کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے...... اگر تم اب بھی اس سے محبت کرتی ہو اور اِس کی دوسری

بیوی بننا قبول کرتی ہو تو پہیہ الٹا گھوم جائے گا۔"

"پتہ نہیں یہ ممکن ہو سکے یا نہ......"

"اگر تم اجازت دو تو میں اس سے بات کروں......؟"

"آپ بات نہ کریں۔ یہ بات میں خود کرلوں گی۔"

"جب تمھاری شادی ہوئی تم ۲۵ برس کی تھیں۔ اب تم پینتیس برس کی ہو۔ ابھی تمھارے پاس نئی زندگی شروع کرنے کی مہلت ہے اور اتنا تجربہ ہے تمھارے پاس کہ زندگی کا فیصلہ کر سکو...... تاہم......" جبران خان کھڑا ہو گیا...... "اب میری بڑی آپا حیات نہیں جنھوں نے مجھے پالا تھا۔ اور باقی بہنیں بھی سسرال میں سدھاریں۔ مجھے بھی کوئی مجبوری نہیں"...... ہاتھ اٹھا کر بولا...... "میں اپنے وعدے پر آج بھی قائم ہوں۔"

☆☆☆

پھر معاملات تیزی سے آگے بڑھے۔ ماہ نور نے ہر دوسرے تیسرے مہینے شہر جانا شروع کر دیا۔ خاندان والے اس کے آگے پیچھے پھرنے لگے۔ وہیں اس کی مرغوب کی دو چار خفیہ ملاقاتیں بھی ہو جاتیں۔ مرغوب تو جی جان سے چاہتا تھا کہ اسے اپنا لے۔ لیکن اس شادی کو خفیہ رکھنے پر بہت زور دے رہا تھا۔ ماہ نور اسے خفیہ نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ اس کے اندر غصے کا زہر بھرا تھا۔ وہ کہتی تھی' ان لوگوں نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے...... ہمیں جدائی کے راستوں پر ڈال دیا۔ اور خود اپنی نئی رشتہ داریاں بنالیں۔ یہ خود غرض لوگ ہیں۔ اب ہمیں ان کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔ مگر مرغوب کا موقف یہ تھا کہ رفتہ رفتہ ظاہر کریں گے۔ شروع میں انہیں پتہ لگ گیا تو پھر کوئی رخنہ ڈال دیں گے۔

جبران خان کا بھی یہی خیال تھا کہ نکاح سے پہلے کسی کو اس بات کی بھنک نہیں پڑنی چاہیے۔

پھر جب دونوں نے باقاعدہ شادی کا فیصلہ کرلیا تو جبران خان نے قانون کے مطابق ماہ نور کو طلاق دے دی۔ اس کی نوازشوں کے شکریے میں اسے گاؤں کا ایک گھر اور ہر وہ چیز جو

اس کی ملکیت تھی لے جانے کی اجازت دے دی۔ مگر طلاق کو خفیہ رکھا گیا۔ جبران خان نے کہا کہ عدت کی مدت ختم ہونے تک وہ اسی حویلی میں رہے گی۔ اسی طرح اپنے معمولات ادا کرتی رہے گی۔ وہ چند مہینوں کے لیے یورپ چلا جائے گا۔ اور جب عدت کی مدت ختم ہو جائے گی تو اس کا نکاح مرغوب سے کروا کے اسے رخصت کر دے گا۔ واپسی پر ہر بات کا جواز وہ خود پیدا کرے گا۔

چنانچہ طلاق کے کاغذات مکمل ہونے کے بعد جبران یورپ چلا گیا۔ ماہ نور نے مصلحتاً شہر جانا کم کر دیا۔ وہ دونوں زیادہ تر فون پر باتیں کر لیتے تھے۔ کبھی کبھی دفتر کے ٹور کا بہانہ کر کے، مرغوب اسے کالج میں ملنے آ جاتا تھا۔ کیونکہ ماہ نور نے اسے حویلی میں آنے سے منع کر دیا تھا۔

نہ جانے یہ بات کیسے باہر نکلی...... مگر نکل گئی۔ سب سے پہلے مرغوب کی بیوی مہوش کو شک ہوا، پھر اس نے خاندان میں ایک حشر اُٹھا دیا۔

مرغوب کے والدین اس کے سر ہو گئے۔ ماہ نور کی ماں گاؤں دوڑی آئی۔ بیٹی کو لعنت ملامت بھی کی اور منت سماجت بھی۔ ہر وہ حربہ استعمال کیا گیا جو ایسی شادی کو روکنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر اس بار نہ جانے کیا ہوا، جس قدر ماہ نور کو روکا جاتا وہ اندر ہی اندر ضد میں آتی جاتی۔ اس نے دل میں پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ وہ مرغوب سے ضرور شادی کرے گی۔ اس کے پاس اب اس کے سوا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔

ماں تو یہاں تک کہہ گئی تھی کہ اگر تم نے ایسا قدم اُٹھایا تو تمھاری بھتیجی کو طلاق ہو جائے گی، تمھارا بھائی مہوش کی بہن کو طلاق دے دے گا۔ تمھاری وجہ سے دو گھر برباد ہو جائیں گے۔ اب تم شہر آنے کی جرأت نہ کرنا۔ دس سال نہیں آئی تو ہمیں کیا فرق پڑا ہے۔ اب گاؤں ہی تمھارا ٹھکانہ ہے...... وغیرہ وغیرہ......

ماں کے جانے کے بعد ماہ نور اندر ہی اندر کھولتی رہی۔ اس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ یہ شادی ضرور کرے گی۔ دو نہیں چاہے دس گھر برباد ہو جائیں۔

☆☆☆
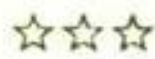
اس روز دفتر کا کام ختم کرنے کے بعد ابھی وہ دفتر میں بیٹھی ہوئی تھی کہ دور سے اس نے مرغوب کی کار کو آتے دیکھا۔ دو دن پہلے اس کی فون پر بات ہوئی تھی۔ اور اس نے کہا تھا کہ وہ کسی طرح گاؤں آئے گا۔ اس سے چند ضروری باتیں کرنی ہیں۔

اور وہ بھی اسے اپنے اٹل فیصلے سے آگاہ کرنا چاہتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد مرغوب دفتر کے اندر آ گیا۔ ماہ نور تواضع میں مصروف ہوگئی۔ چائے پینے کے بعد وہ بولا...... ''نورا! اگر تم ٹھنڈے دل سے میری بات سنو تو میں آج ایک تجویز لے کے آیا ہوں تمھارے پاس!''

''آج کل میں کچھ بھی ٹھنڈے دل سے نہیں سوچتی۔ بہر حال تم بتاؤ کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''دیکھو نور! سارا خاندان، ہم دونوں کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ میری بیوی نے تو ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے۔ تمھاری بھتیجی کو اس نے تمھاری امی کے گھر بھیج دیا ہے۔ آج کل میں تمھارا بھائی بھی اس کی بہن کو نکال دے گا۔''

''کیا تم یہی کہنے آئے ہو مجھے؟ ایسے ڈراوے تو اُنھوں نے ہماری شادی کے معاملے پر بھی دیے تھے لیکن بعد میں کیا ہوا...... بالآخر سب ایک ہو جاتے ہیں۔''

''سنو نورا!'' مرغوب جذباتی انداز میں بولا...... ''میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ میں تم سے شادی ضرور کروں گا۔''

ماہ نور کو ذرا سکھ کی سانس آئی۔ کہنے لگی: ''اب بتاؤ تجویز کیا ہے!''

رکتے رکتے بولا: ''دفتر کی طرف سے مجھے ایک مہینے کے لیے باہر بھیجا جا رہا ہے۔ میں نے یہ آفر قبول کر لی ہے۔ اور میں نے سوچا ہے میں نکاح کر کے تمھیں ساتھ لے جاؤں گا۔ وہاں اپنی محبت کو پروان چڑھائیں گے۔ اس دُنیا سے دُور زندگی کی خوشیاں حاصل کریں گے۔ پورا ایک مہینہ۔ ایک دوسرے میں مگن رہیں گے اور دُنیا کے سارے دُکھ بھول جائیں گے۔''

''پھر......''

''پھر ہم واپس آ جائیں گے۔''

''پھر......''

''تم جانتی ہو...... کبھی نہ مل سکنے کی حسرت میں جینے سے بہتر ہے' آدمی تھوڑا عرصہ ایک ساتھ جی لے۔''

''کیا کہہ رہے ہو تم مرغوب؟'' ماہ نور چیخی۔

''ماہ نور! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ واپس آ کر میں تمھیں طلاق دے دوں گا تاکہ تم اپنے شوہر سے دوبارہ شادی کر سکو۔ ہماری تمنا بھی پوری ہو جائے گی اور تمھارا حلالہ بھی ہو جائے گا۔

غصے سے تھرتھراتی ہوئی ماہ نور کھڑی ہو گئی۔ اس کے نتھنے پھڑپھڑانے لگے۔ منہ سے جھاگ نکلنے لگی۔ مگر اس نے اپنی آواز پر قابو پالیا' اور چبا چبا کر کہنے لگی: پیشتر اس کے کہ میں یہ پیپرویٹ تمھارے سر میں دے ماروں' یہاں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفعان ہو جاؤ۔''

اس نے مڑ کر نہیں دیکھا اور موٹر میں بیٹھ کر حویلی آ گئی۔ دھم سے بستر پر گر گئی۔ جب آنسوؤں کا سیلاب رکا تو اپنے حواس بحال کر کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ میز پر ایک خط پڑا تھا۔ جلدی سے اُٹھایا اور چاک کیا۔ یہ جبران کا خط تھا۔ لکھا تھا:

عزیز دوست!

میں سمجھتا تھا عظیم عورتیں صرف ہمارے ملک میں پیدا ہوتی ہیں۔ مگر جب سے کیتھرائن سے ملا ہوں' سوچ رہا ہوں...... عظمت' اخلاص بلند ظرفی کسی خاص ملت یا مذہب کی میراث نہیں ہے۔ یہ ہر قوم کی عورت میں مل سکتی ہے......

یوگوسلاویہ کے سفر میں مجھے کیتھرائن ملی تھی۔ اگلے سارے سفر ہم نے اکٹھے کیے۔ ایک دن اس کے اصرار پر میں نے اسے اپنی اور تمھاری کہانی سنا دی۔ تمھارا انجام سن کر وہ بہت خوش ہوئی۔ ایک دن مجھے کہنے لگی: ''میری شادی کی عمر تو نکل گئی ہے۔ مگر انعام کے طور پر میں تمھاری ہمسفر بننا چاہتی ہوں۔ مجھے بھی صرف تم جیسے انسان کی تلاش تھی۔ اور پھر مجھے ایشیائی ملکوں میں

رہنے کا شوق بھی ہے۔ میں پاکستان میں تمھارے ساتھ خوش رہوں گی۔"

پچھلے ہفتے ہم نے سادگی سے شادی کر لی ہے۔ یوں جب میں ایک میم لے کر آؤں گا تو تمھاری طلاق کا جواز آپ ہی آپ پیدا ہو جائے گا۔ قدرت کتنی مسبب الاسباب ہے...... اب لوگ تمھیں نہیں مجھے بُرا بھلا کہیں گے!

میں بس آنے والا ہوں۔

خدا حافظ

تمہارا ممنونِ احسان

جبران خ

☆☆☆

مہنگی ملک

اعلان ہوا تو مقصودہ جہاز میں آکر بیٹھ گئی۔

جہاز کے اندر آکر اُس کی طبیعت اور بھی منغض ہونے لگی۔ اُف کتنے بدتمیز لوگ ہیں، اس نے جل کر سوچا...... جہاز پر چڑھنا نہیں آتا، سامان رکھنا نہیں آتا، سیٹ کا نمبر تلاش کرنا نہیں آتا۔ ایک شہر سے دوسرے شہر میں جا رہے ہیں۔ سامان کے ساتھ لدے ہوئے ہیں۔ عورتوں کو دیکھو، یوں بن ٹھن کر سفر کر رہی ہیں جیسے شادی میں شرکت کرنے جا رہی ہوں۔ بچوں کو بے مہار چھوڑ رکھا ہے، وہ جہاز کے اندر یوں بھاگ رہے ہیں جیسے کسی پلے گراؤنڈ میں ہوں۔

اونہہ...... اس نے منہ سکوڑ کر شیشے کی طرف کر لیا۔

ذرا سی بارش ہوئی اور فلائٹ لیٹ ہوگئی۔ کھٹارا جہاز ہیں تو ایئر لائن رکھنے کا شوق کیوں پال رکھا ہے۔ بڑی سُست الوجود قوم ہے، یہ کبھی ترقی نہیں کر سکتی...... کبھی نہیں۔

یہاں جب بھی آؤ حالات پہلے سے ابتر نظر آتے ہیں۔

ایک عورت اس بُری طرح سے سامان گھسیٹتے ہوئے گزری، اس کے گھٹنے کو ٹھوکر مار گئی۔ دیکھو اس موٹی کو...... اس نے اندر ہی اندر دانت پیسے...... ایک تو اپنا وجود بھاری اس پر اپنے وزن جتنے تھیلے اُٹھا رکھے ہیں۔

باہر ابھی تک بارش ہو رہی تھی اور بھیگے ہوئے لوگ دھپ دھپ کرتے چلے آ رہے تھے...... افوہ! اس نے اپنا چہرہ پھر شیشے کی طرف کر لیا۔

ایک تو سارا دن امریکن ایمبیسی میں بحث کرتے گزرا تھا۔ وہ تھک کر چور ہو گئی تھی۔ اب

ی بار خلاصی ہو جائے تو وہ پھر کبھی پاکستان نہیں آئے گی۔

ایک وہ بھی زمانہ تھا جب وہ پاکستان سے جاتے وقت بہت روئی تھی۔ کیسا احمقانہ زمانہ تھا وہ! امریکا سے اس کے لیے ایک رشتہ آیا! اور والدین نے جھٹ ہاں کر دی۔ فٹ شادی ہو گئی۔ سہیلیاں مبارکیں دیتی نہ تھکتیں۔ کزنیں رشک سے کہتیں: ''ہائے اللہ اب تم امریکا جا بسو گی۔ کتنی خوش نصیب ہو؟'' مگر وہ بسورتی کہ پتہ نہیں وہ زندگی کیسی ہوگی؟ جانے شوہر کا مزاج کیسا ہوگا۔

اس کے شوہر کی پیدائش تو پاکستان کی تھی، مگر پرورش امریکا میں ہوئی تھی۔ اس لیے جلد ہی ان کی ازدواجی زندگی سے دھواں اُٹھنے لگا۔ زاہد ملک کو اس تیز تر زندگی کے ساتھ بھاگتی ہوئی یار صفت عورت درکار تھی۔ مقصودہ سارا دن گھر میں بیٹھی بسورتی رہتی۔ مجھے یہ لا دیں۔ مجھے وہ لا دیں۔ ہائے گروسری ختم ہوگئی کیا کروں؟ زاہد ملک نے بہت کہا، میں تمھیں ایک چھوٹی موٹر لے دیتا ہوں، ڈرائیونگ سیکھ لو۔ سودا سلف اور ضرورت کی چیزیں خود لے آیا کرو۔ میری جان نہ کھایا کرو۔ مقصودہ کانوں کو ہاتھ لگا لیتی۔ اسے وہاں کا ٹریفک دیکھ کر ہول اُٹھنے لگتے۔

دو سال بیت گئے۔ نہ مزاج ملا نہ دل۔ البتہ ایک لڑکی پیدا ہوگئی۔

تیسرے سال ان میں طلاق ہوگئی۔ بیٹی بھی انھیں جوڑ کے نہ رکھ سکی۔ گو مقصودہ کو گرین کارڈ مل چکا تھا، پھر بھی وہ طلاق لے کر پاکستان آگئی جیسے کوئی اپنی غلطی درست کر کے دوبارہ سوال حل کرتا ہے۔

اس نے تعلیم کا سلسلہ پھر سے جوڑا۔ بی اے کر کے گئی تھی۔ اب انگریزی میں ایم اے کیا۔ ڈرائیونگ سیکھی۔ ایک پرائیویٹ کمپنی میں جاب کر کے اپنی خود اعتمادی بحال کی۔ امریکا آتی جاتی رہی۔

پانچ سال بعد اس کی ملاقات سہیل اعوان سے ہوگئی۔ وہ امریکا جانے کے لیے بے تاب تھا۔ اور مقصودہ بھی دوبارہ امریکن زندگی میں کھپ جانا چاہتی تھی۔ اُنھوں نے شادی کر

لی۔ بیٹی کو نانی کے پاس چھوڑ دیا اور دونوں امریکا آ گئے، اور نئی زندگی کی ابتداء کی۔

اب مقصودہ کے پاس علم تھا اعتماد تھا' اور تجربہ بھی تھا۔ یہاں اس نے ایک انشورنس کمپنی میں ملازمت کر لی۔ شان سے موٹر چلاتی۔ امریکی لب و لہجے میں انگریزی بولتی۔ باہر کے سارے کام منٹوں میں کر آتی۔ سہیل اعوان کو بڑی مشکل سے ایک ڈیپارٹمنٹل سٹور پر نوکری ملی تھی۔ وہ امریکا کے بندھے ٹکے ماحول سے سمجھوتہ نہیں کر پا رہا تھا۔ پھر زندگی ایک ناہموار سڑک پر دوڑنے لگی۔ بس ایک سال ہی یہ گاڑی کھینچی جا سکی۔ پھر طلاق ہو گئی۔ سہیل اعوان اپنی نامرادیوں سمیت پاکستان واپس چلا گیا۔ مگر مقصودہ اپنے ماحول کا حصہ بن گئی۔ یہی خوبصورتی ہے امریکا میں کہ وہاں کچھ بھی معیوب نہیں ہوتا۔

دیکھتے دیکھتے مقصودہ نے وہاں اپنا گھر خرید لیا۔ اچھا جاب تھا اس کے پاس۔ دو تین سال کے بعد پاکستان اپنی بیٹی سے ملنے آتی۔ اس کے اکاؤنٹ میں ڈھیر ساری رقم جمع کرا دیتی۔ اس کے لیے کھلونے اور ملبوسات لاتی۔ عزیز و اقرباء کو متاثر کرتی' اور واپس چلی جاتی۔

اب کے وہ بیٹی کو ساتھ لے جانے کا تہیہ کر کے آئی تھی۔ اس سال بیٹی نے میٹرک کا امتحان دے لیا تھا۔ [illegible] یابی ہو گئی تھی۔ وہ چاہتی تھی، سلکی ملک کو امریکا کی کسی یونیورسٹی میں داخل کرا دے او [illegible] طوط پر اس کی پرورش کرے تاکہ شادی کے بعد اس کا انجام ماں والا نہ ہو۔

مگر اس کی والدہ اس بات کے حق میں نہیں تھیں۔ وہ کہتی تھیں، اب مقصودہ بھی واپس پاکستان آ جائے۔ بہت دولت کمالی ہے اس نے۔ یہیں پر کوئی مناسب جاب ڈھونڈ لے۔ یہاں اعوان خاندان میں بڑے اچھے رشتے ہیں۔ سلیقہ ملک کو یہیں کہیں بیاہ دے۔ دفع کرے مزید تعلیم کو۔ نانی نے بڑے چاؤ سے اس کا نام سلیقہ خاتون رکھا تھا' مگر مقصودہ اپنی بیٹی کو سلکی ملک بنانے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ اسے دوسری مقصودہ نہیں بنانا چاہتی تھی کیونکہ پندرہ سال امریکا میں رہ کے وہ خود مِکی ملک بن گئی تھی، جو مقصودہ سے قطعی مختلف تھی۔

اپنے کالج کے زمانے میں وہ مقصودہ ملک کہلاتی تھی۔ مگر ساری لڑکیاں اُسے "بونگی"

کے نام سے بلاتی تھیں۔ اور اب متی ملک بن کے وہ ''سمارٹی'' کہلاتی تھی۔

بدقسمتی سے سلکی کی پیدائش پر وہ پاکستان آ گئی تھی، اس لیے سلکی کو امریکا کی شہریت نہ مل سکی تھی۔ چنانچہ اس سال وہ بیٹی کا ویزہ لگوا کے اسے لے جانے آئی تھی۔ اُنھوں نے بھی سو قسم کے اعتراض لگا دیے' ہر بار پھر آنے کو کہا۔ یہ اسلام آباد میں اس کا تیسرا چکر تھا، پھر بھی کام نہیں بنا تھا۔ وہاں دفتر والوں سے تلخ و ترش ہو گئی۔ ایئر پورٹ پر آئی تو پتہ چلا کہ موسم کی خرابی کی وجہ سے فلائٹ لیٹ ہو گئی ہے۔ اس کی بیزاری سوا نیزے پر پہنچ گئی۔ لاؤنج میں بیٹھے بیٹھے وہ سوچتی رہی، یہ قوم تو سو سال تک نہیں بدل سکتی۔ یہاں وقت صرف ضائع کرنے کو ہوتا ہے۔

اور وہ...... وہ تو ایک منٹ بھی فارغ نہیں بیٹھ سکتی۔ اس کی زندگی تو چکی کے پاٹ کی طرح چلتی رہتی ہے۔ اب تو وہ بڑے ٹھاٹھ سے رہتی تھی۔ شروع شروع میں اُسے ٹھاٹھ دکھانا اچھا بھی لگتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے کئی کاموں میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ اپنی ایک پاکستانی دوست کے ساتھ مل کر ایک بوتیک شاپ کھول لی تھی۔ ایک واقف کار کے ساتھ مل کر کسی ایئر لائن کی کیٹرنگ کا ٹھیکہ بھی لے لیا تھا۔ اس میں ہی وارے نیارے ہو گئے تھے۔ اس لیے اب اس نے ملازمت چھوڑ دی تھی۔ گھر بھی بڑا لے لیا تھا۔ دو بیڈ روم تھے۔ ایک کشادہ بیس منٹ تھی۔ باہر لان تھا۔ اس کے کنارے سوئمنگ پول تھا۔ اس کے پاس کالی شیورلیٹ تھی۔ مگر مہمانوں کے لیے اس نے ڈیزل کی چھوٹی گاڑی لے لی تھی۔

گرمیوں کا سیزن کیا آتا' اس کے پاس مہمانوں کا تانتا بندھ جاتا۔ کچھ تو دوست ہوتے' مگر باقی سب جان پہچان والوں کے جان پہچان والے ہوتے۔ بس ذرا اخلاق سے پیش آؤ۔ منہ اُٹھائے چلے آتے ہیں۔ کسی کو ایئر پورٹ سے لینے جا رہی ہے۔ کسی کو ایئر پورٹ چھوڑنے جا رہی ہے۔ کسی کو شاپنگ مال پہ بٹھا آئی ہے۔ کسی کو شاپنگ پلازا سے پک کرنے جا رہی ہے۔ کئی کئی دن کا کھانا پکا کے فریز کر دیتی۔ آنے جانے والے مہمان اس کی تعریفیں کرتے نہ تھکتے۔ وہاں اس کا نام زبان زدِ عام ہو گیا تھا۔ کوئی مسئلہ ہوتا، کوئی مشکل ہوتی، کسی کو ٹھہرانا ہوتا' فوراً متی ملک کا نام لیا جاتا۔ اس کے گھر کی سجاوٹ دیدنی تھی۔ ہر کمرے میں جدید سہولیات' ٹی وی،

ڈش اور کمپیوٹر ہمہ وقت موجود ہوتا۔ وہ ایک خودمختارانہ زندگی گزارتی، جسے دُور سے لوگ رشک کی نگاہ سے دیکھا کرتے۔

اب کچھ عرصہ سے وہ ایسے ناخواندہ مہمانوں سے تنگ آ گئی تھی۔ ناز برداریاں اور تواضع کر کر کے اوب گئی تھی۔ اب اپنی بچی کو اپنے پاس بلانا چاہتی تھی۔ اب آرام اُور سکون کی زندگی بسر کرنا چاہتی تھی۔ اب اسے گھر بیٹھے پیسہ کمانے کا گُر آ گیا تھا۔ اگر سلکی امریکا آجاتی تو وہ گھر اس پر چھوڑ کر کئی اور کام کر سکتی تھی۔

مگر سلکی کو امریکا کا ویزہ نہیں مل رہا تھا۔ اور وہ اس دن کو کوس رہی تھی جب زچگی کے لیے وہ ضد کر کے پاکستان آ گئی تھی۔ حالانکہ وہ کئی پاکستانی بیگمات کو جانتی تھی جو محض بچے کی پیدائش کے لیے امریکا چلی جاتی تھیں۔ اور فخر سے کہا کرتی تھیں، یہ تو پیدائشی امریکا کا شہری ہے، اسے تو بڑا ہوتے ہی وہاں بھیج دونگی۔

اس مرتبہ وہ تہیہ کر کے آئی تھی کہ اپنی بیٹی کو لے کر ہی جائے گی، مگر اس مرتبہ بھی ایک اعتراض لگ گیا تھا اُور اسے چوتھی مرتبہ آنے کو کہا گیا تھا۔

سوچتے سوچتے اس کا ذہن پھر جہاز کے اندر پلٹ آیا۔ مسافروں کے آنے کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا۔ پائلٹ بار بار اعلان کر رہا تھا کہ برسات کی وجہ سے جو فوکر طیارہ ملتان اور لاہور کی سواریاں لے کر نہیں جا سکا، ان کو اسی جہاز میں اکوموڈیٹ کرنے میں تھوڑا وقت لگے گا۔

اُف اللہ! اب کچھ اور ہونق اور بھیگے ہوئے مسافر آئیں گے۔ وہ تو مسافروں کا اور ان کے سامان کا جائزہ لے لے کر تھک چکی تھی۔

یوں وہ سیاحت کی بڑی شوقین تھی۔ کئی بار سہیلیوں کا گروپ مختلف ملکوں کی سیاحت کو نکلا تھا۔ ان سب ملکوں میں جاپان اور ترکی اُسے بہت پسند آئے تھے۔ وہ بالکل سیاحوں کی طرح سفر کیا کرتیں۔ ایک تنگ جینز اور دو بلاؤز تھیلے میں ڈال لیتیں، ایک دو خوبصورت سوٹ رکھ لیتیں۔ ایک سلیپنگ بیگ ہوتا، اور باقی ضروریات کی چیزیں اپنے شاپنگ بیگ میں رکھ کر نکل

پڑتیں۔ کتنا لطف آیا کرتا۔ تب اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ بین الاقوامی سفروں میں زادِ راہ کم رکھنا چاہیے۔ مگر ان پاکستانیوں کو کبھی سمجھ نہیں آسکتی۔ خرید و فروخت تو اس طرح کرتے ہیں جیسے کہ یہ ان کی زندگی کی آخری شاپنگ ہو۔ سامان کو اپنے اعمال سے بھی زیادہ بھاری کر لیتے ہیں۔ بٹوے میں ایک ڈالر بھی بچا کے نہیں رکھتے۔ اور جب سرچارج لگ جاتا ہے تو ہونقوں کی طرح منہ اُٹھا اُٹھا کر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ اُدھار کے لیے ہاتھ پھیلاتے ہیں زندگی کے مختلف تجربے علم حاصل کرنے سے ہوتے ہیں۔ یا سفر کرنے سے...... وہ سوچنے لگی' پھر اس نے خود ہی فیصلہ دیا۔ سفر انسان کو زیادہ تجربہ کار بنا دیتا ہے۔

بھانت بھانت کے لوگ، رنگ رنگ کی زمین...... اور ہر زمین کا مزاج الگ...... اس نے دُنیا کے سارے بڑے ملکوں کے سفر کر لیے تھے۔ اس کا اپنا گھر نوادرات کا عجائب خانہ لگتا تھا۔ ہر ملک کا کوئی نہ کوئی سوونیئر وہاں پڑا تھا......

ایک سفید ریش سفید بالوں والا بابا ہانپتا کانپتا جہاز میں چڑھ آیا۔ لگتا تھا شاید پہلی مرتبہ جہاز میں سفر کر رہا ہے۔ ہاتھ میں سوٹی بھی تھی۔ اور ایک چھوٹا سا سوٹ کیس بھی پکڑا ہوا تھا۔ درمیان میں کھڑا حسرت سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ پتہ نہیں من چلی ایئر ہوسٹس اس وقت کیبن میں کیا کرنے چلی گئی تھی۔ مقی نے گردن اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا' شاید ہی جہاز میں اب کوئی سیٹ خالی ہو' دیکھتے دیکھتے ساری خالی سیٹیں پُر ہو گئی تھیں۔

آگے آؤ بابا جی...... آگے آؤ بابا جی...... جہاز کے کچھ مسافر مشورہ دینے لگے۔ کسی نے کہا سامان اُوپر رکھ دو، اُوپر اُوپر، وہ جو خانہ بنا ہے نا اِس میں۔ بابا آگے آیا' سوٹی کو کسی سیٹ کے ساتھ لٹکایا۔ ہاتھ اُوپر کر کے سامان کے خانے کھولنے کی کوشش کی' کھولنا ہی نہ آیا۔

توبہ...... مقی نے جل کر منہ بنایا۔

بابا پھر ہاتھوں سے اِدھر اُدھر ٹٹولنے لگا۔ کچھ مسافر اس کی بے بسی پر زیرِ لب مسکرانے لگے۔ ایک سمارٹ سا نوجوان بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اُٹھا۔ وہ مقی کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس نے بابے کے ہاتھ سے چھوٹا سا سوٹ کیس لے لیا۔ سامان کا خانہ کھولا اور اِس میں

قرینے سے جگہ بنائی۔ وہاں بابے کا سامان رکھ کے اُسے بند کر دیا۔ بابا احسان مند سا کھڑا کچھ کہنے کا حوصلہ کر رہا تھا کہ اسی نوجوان نے بابے کے ہاتھ سے چٹ لے کر دیکھی اور بولا......

''بابا جی! آپ یہاں میری سیٹ پر بیٹھیں' آپ کی سیٹ بہت آگے ہے، میں وہاں چلا جاؤں گا''۔ اس نے کانپتے لرزتے بابے کو سیٹ پر بٹھا دیا۔ یہی نہیں' اس کی سوٹی لے کر زمین پر ٹکائی۔ اس کے کپڑے سمیٹ کر اِس کی بیلٹ بند کی' اور بولا: ''آپ تسلی سے بیٹھے رہیں' جہاز کھڑا ہوگا تو میں آپ کی بیلٹ کھول دوں گا' اور سامان اُتار کے آپ کو نیچے پہنچا دوں گا۔''

پھر وہ نوجوان آگے چلا گیا۔

جتنے مسافر اس کارروائی کو خندۂ استہزاء کے ساتھ دیکھ رہے تھے، اُنھوں نے اپنی گردنیں جھکا لیں اور اپنے آپ کو مصروف کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

مِتّی نے مڑ کر ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے بابے کو دیکھا اس نے سیٹ کے ساتھ ٹیک لگالی تھی۔ آنکھیں بند کر لی تھیں۔ دونوں ہاتھ گھٹنوں پر اس طرح رکھے ہوئے تھے جیسے التحیات پڑھ رہا ہو۔ لیکن اس کے پپوٹے پھڑک رہے تھے' اور مندی آنکھوں سے ایک بے رنگ سا پانی نکل رہا تھا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔

پائلٹ کے اعلان کے بعد جہاز ٹیک آف کے لیے تیار ہو گیا۔

اس آدھے گھنٹے کے سفر میں مِتّی نے کئی بار گردن موڑ کر بابے کی طرف دیکھا۔ اور پھر جب وہ جہاز کی سیڑھیاں اُتر رہی تھی تو وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ سب کچھ وائنڈ اَپ کر کے اگلے سال وہ پاکستان آجائے گی۔

☆☆☆

افسانچہ

جان، جان؟

تم جانو یا نہ جانو میں تو جان لوں گا......

لڑکا یقینی انداز میں بولا......

ہاں میں جان گئی ہوں......لڑکی سکون سے بولی۔

وہ بحث کرتے کرتے تھک گئے۔

آگے دریا کا پل آ گیا۔

لڑکی نے ٹرین کا دروازہ کھولا اور دریا دیکھنے لگی۔

پھر یکایک اُس نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔

لڑکے نے کتاب سے نظر اُٹھا کر پہلے دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر اس گرداب کو دیکھا جو لڑکی کے چھلانگ لگانے سے بن رہا تھا۔

پھر گاڑی کی زنجیر کو دیکھا......

اور پھر سیٹ پر لیٹ کر اطمینان سے کتاب پڑھنے لگا

☆☆☆

محرمِ راز

یہ پیپل آج بھی اسی طرح موجود ہے۔ زمانے کے سرد و گرم نے اس پر کوئی اثر نہیں کیا۔ لوگ باگ سچ ہی تو کہتے تھے کہ اس پیپل پر آسیب ہے۔ اس گھنیرے پیپل کے پتے ہمہ وقت سر ہلاتے رہتے ہیں۔ جب پُراسرار ہوا، نہ ہمیں نظر آتی ہے نہ محسوس ہوتی ہے، تب بھی یہ اربوں کھربوں پتے دونوں ہاتھوں سے دھیمی دھیمی اور غیر محسوس تالیاں بجاتے رہتے ہیں۔ ایسے لگتا ہے یہ کچھ دیکھ رہے ہیں، کچھ دکھا رہے ہیں...... غیر مرئی قوتوں سے ہم کلام ہیں۔ پتہ نہیں اس گھنے پیپل کی عمر کیا ہوگی، صدیوں پرانا لگتا ہے!

جب ہم بچے تھے تو اِس کے نیچے کھیلا کرتے تھے۔ ہزار بار بزرگوں سے ڈانٹ پڑی۔ ہر بار ہم باز نہ آئے۔ آج کل کے بچے عجیب ہیں، پیپل کے تلے آکر کھیلتے ہی نہیں۔ میں ترس گئی ہوں کہ کوئی بھولا بھٹکا بچہ اِدھر آئے اور میں اسے ڈانٹ پلا کے اِس روایتی کہانی کو آگے بڑھاؤں، بھوت پریت کی سنی سنائی باتیں ان کو بتاؤں مگر پتہ نہیں یہ کیسے بچے ہیں؟ بھوت پریت کی بات سن کر ٹھٹھہ لگاتے ہیں، اور کہتے ہیں یہ سب کتابی باتیں ہیں، آج کل ایسی مخلوق کہاں......؟

ہمارا زمانہ ایسا تھا، اِدھر کسی نے جن بھوت کی کوئی من گھڑت داستان سنائی اُدھر ہم رات گئے تک آیت الکرسی پڑھ کر چاروں کونوں میں پھونکتے رہے۔ اگر کبھی رات کو ڈر کر چلائے تو دادیوں نانیوں نے تعویذ پہنانا شروع کر دیئے۔ ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی بجائے کسی مولوی صاحب کے پاس لے گئیں۔ کئی کئی دن تک دم کیا ہوا پانی پینا پڑا۔ طرح طرح

کی بدپرہیزی کرنے سے اگر پیٹ میں مروڑ اُٹھا تو اُسے بوڑھے پیپل کا انتقام کہا گیا اور آئندہ شام سے پیپل تلے نہ جانے کی قسمیں دی گئیں۔ دو چار روز ڈرتے سہمتے گزر گئے...... ہم پھر پیپل تلے پائے گئے۔ بات دراصل یہ تھی کہ ہمارے گنجان آباد محلے میں کھیل کا کوئی میدان نہیں تھا۔ گلی کی نکڑ پر ایک قدیم ترین پیپل تھا جس کا تنا باہر کو نکلا ہوا تھا۔ اس کی لحیم وشحیم شاخیں کئی گھروں پر سایہ کیے ہوئے تھیں یعنی پانچ چھ گھرانے باقاعدہ اِس کی چھاؤں سے فیض یاب ہو رہے تھے۔ اس کی لمبی لمبی جڑیں سلسلہ وار ان سارے گھروں میں لٹکی ہوئی نظر آتی تھیں۔ ان جڑوں کو سارے بچے پیپل کی ڈاڑھی کہا کرتے تھے۔ پیپل کا تنا گولائی میں اتنا بڑا تھا کہ گلی کے باہر حمیدے نے وہاں فالودے کی دوکان کھول رکھی تھی۔ گلی میں چونکہ ہمارا گھر پہلا تھا' اس لیے دُور سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ پیپل ہمارے صحن میں ہے۔ اس کا زیادہ جھکاؤ یہیں پر تھا۔ گرمیوں میں تو اس کی چھاؤں اِتنی پُر لطف اور آرام دہ ہوتی کہ سارے محلے کی لڑکیاں چلچلاتی دوپہروں میں ہمارے گھر آجاتیں اور پیپل کی چھاؤں میں چارپائیاں بچھا کر گُڈے گڑیا کا کھیل رچایا کرتیں' اور جب حق مہر یا ناکافی جہیز پر دو گروہوں کی آپس میں ٹھن جاتی...... اور اکثر کسی نہ کسی بات پر ٹھن ہی جاتی...... تو ایک دوسرے کے گڈے اَور گڑیاں اچھال اچھال کر پیپل کی شاخوں پر پھینک دی جاتیں۔ وہ کسی شاخ میں پھنس کر اُلٹی سیدھی لٹکنے لگ جاتیں۔ ان کی گوٹے والی اوڑھنیاں ہوا میں لہرانے لگتیں اور ان کے مصنوعی بال شاخوں میں پھنس جاتے۔ اس منظر پر دل کھول کر قہقہے لگائے جاتے، تالیاں پیٹی جاتیں' باراتیوں کو رُسوا کیا جاتا۔ لڑائی جھگڑے کے اختتام پر سب لڑکیاں اپنے اپنے گھر میں چلی جاتیں مگر رات کو سوتے میں' ہمیں خوابوں میں یوں محسوس ہوتا جیسے پیپل کے جن نے ہماری گڑیا کو نکال کر پری بنا دیا ہے۔ ہمارا گڈا جن بن گیا ہے اور ہمارے سروں پر کھڑا ہوا کہہ رہا ہے...... بتاؤ تم نے کل میری بے آبروئی کیوں کی تھی...... اور گڑیاں پری بنی کہہ رہی ہے...... اگر کل تم مجھے چوٹی سے پکڑ کر پیپل پر نہ پھینکتے تو آج میں تمھیں کھانے کو چاکلیٹ ٹافیاں اور فالودہ لا کے دیتی...... اگر ایسا خواب دیکھنے سے ہم میں سے کوئی ڈر جاتا تو دادی ماں فوراً پیشانی پر ہاتھ رکھ دیتیں، لاحول پڑھنے جاتیں' پھر

آیت الکرسی پڑھ کر چاروں کونوں میں پھونکیں مارتیں...... ''ہزار بار منع کیا ہے' اِن مرجانیوں کو شام کو کہ پیپل تلے نہ کھیلا کرو...... بڑا بھاری ہے یہ کم بخت...... کسی نہ کسی کی جان لے کر رہے گا۔'' مگر چھٹی کے روز پھر ساری سہیلیاں' نئی گڑیاں اور گڈے ہاتھ میں پکڑے پیپل تلے جمع ہو جاتیں۔ ایک دوسرے کو خواب سنائے جاتے' تعبیریں گھڑی جاتیں' شاخوں میں پھنسے ہوئے گڈے اور گڈیاں دیکھی جاتیں۔ اگر وہ وہاں موجود ہوتے تو بے فکرے ہو کر نئی گڑیا کے نئے گڈے کے ساتھ رشتے طے کیے جاتے' پھر نئے سرے سے کھیل شروع ہوتا اور پھر اس کا انجام وہی ہوتا۔

پیپل کی جو شاخیں ہمارے گھر میں سایہ کیے ہوئے تھیں' ان پر کسی مزار کے درخت کا گمان ہوتا تھا' کیونکہ ان شاخوں پر گڑیوں کی رنگ برنگ اوڑھنیاں' فالتو دھجیاں' گوٹے کناری کے ٹکڑے اور پرانے پراندے لٹکے ہوئے نظر آتے تھے۔ بعض اوقات چھوٹے بچے پتھر کے ساتھ ڈور باندھ کر شاخوں پر پیچا ڈال دیتے اور پتنگ اُڑانے کے انداز میں شاخوں کو ہلاتے رہتے۔ اس طرح پھٹی ہوئی پتنگیں اور لٹکتی ہوئی ڈوریں بھی دیکھی جا سکتی تھیں۔ بادی النظر میں یوں محسوس ہوتا کہ یہ دھاگے اور دھجیاں منت کے لیے باندھی گئی ہیں۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جسے گھر میں کوئی چیز فالتو ملتی وہ اسے پیپل پر پھینک دیتا۔ پرانی جوتیاں تو یہ سوچ کر پھینکی جاتیں کہ جن بھوتوں کو لگ رہی ہوں گی۔ پیپل کی جو لمبی لمبی جڑیں باہر نکل آئی تھیں' اُنھیں ہم پیپل کی ڈاڑھی کہتے تھے۔ بچپن میں ہمیں پیپل کی ڈاڑھی کے ساتھ جھولا جھولنے کی عادت بھی تھی۔ اکثر یوں ہوتا کہ ایک لڑکی ساری جڑیں مٹھی میں پکڑ کے جھولا جھول رہی ہوتی۔ دوسری لڑکی انتقاماً اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتی' جس کے نتیجے میں پہلی لڑکی نیچے گر جاتی۔ گرتے ہی اس کی ٹھوڑی زخمی ہو جاتی یا ماتھے میں سے خون نکلنے لگتا۔ پھر گھر کے بڑے بوڑھوں کو ڈانٹ پھٹکار کے لیے ایک موضوع مل جاتا۔

''یہ منحوس پیپل کسی کی جان لے کر رہے گا۔'' پھر دم درود کروائے جاتے۔ گڑ ملا دلیا پکا کر غریب بچوں کو کھلایا جاتا۔ گھر کا فرش دھو کر پیپل کے نیچے اگربتی اور لوبان جلائے جاتے۔ اِدھر

بزرگوں کی نظر بچی اور ہم سب پھر پیپل کے نیچے پائے گئے۔ پیپل رات کو جتنا ڈراؤنا اور خوفناک نظر آتا' دن کے وقت اتنا ہی رومانٹک اور پُرکشش نظر آتا تھا۔ رات کو اس کے ڈر سے کوئی بھی اکیلا صحن میں نہیں نکلتا تھا۔ مگر دن کے وقت کوئی اس سے دُور جا کر نہیں کھیلتا تھا۔ تب ہمیں اور بہت سی باتوں کی سمجھ بھی نہیں آتی تھی۔ یہی کہ شبو پھوپھو چاندنی راتوں میں' سفید کپڑے پہن کے' کانوں میں موتیا کے سفید پھول ڈال کے' رات رات بھر پیپل کے آس پاس کیوں ٹہلتی رہتی تھیں۔ دادی ماں کے کوسنے اور ابا میاں کی پھٹکار ان پر اثر نہیں کرتی تھی۔ وہ مسلسل ٹہلتی رہتیں۔ پھر کسی شاخ کا سہارا لے کر چاند کو گھورنے لگتیں۔ ''اللہ شبو پھوپھو یوں شاخ کو نہ جھکایئے' ہماری گڑیا پنچھی بن کر اُڑ جائے گی۔'' اور شبو پھوپھو ہنس کر شاخ کو اور بھی جھٹکے دینے لگتیں۔

گھر میں شبو پھوپھو پر بہت چہ میگوئیاں ہونے لگیں کیونکہ اُنھیں کوئی رشتہ پسند ہی نہیں آتا تھا۔ جو بھی دیکھنے آتا' اس میں نقص نکال دیتیں اور اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑ جاتیں۔ ہمیشہ شرط رکھتیں' پہلے مجھے لڑکا دکھایا جائے۔ جب لڑکا کسی طرح دکھایا جاتا تو اس میں کوئی عیب نکل آتا۔ کبھی قد چھوٹا ہوتا...... کبھی رنگ کالا ہوتا...... کبھی عینک لگانے والا ہوتا...... لیکن شبو پھوپھو کی ایک ہی دھن کہ لڑکا بہت خوبصورت ہونا چاہیے۔ چچیاں' ممانیاں' خالائیں انھیں سمجھایا کرتیں...... ''مرد کی صورت کون دیکھتا ہے...... مرد کے گن اچھے ہونے چاہئیں...... اچھا وہی جو اپنی بیوی کو اچھا رکھے...... ارے خوبصورت مرد تو ہرجائی ہوتے ہیں۔ نخرے والے ہوتے ہیں۔ بیوی کو جوتے کی نوک پر رکھتے ہیں۔ باہر کی عورتیں کب انھیں چھوڑتی ہیں......'' مگر شبو پھوپھو کی ایک ہی رٹ...... ''بھلے ہی وہ میری پروا نہ کرے مگر ایسا خوبرو ہو جیسے یونانی شہزادہ...... صبح اُٹھتے ہی اس پر نظر پڑے تو جی نہال ہو جائے۔''

سمجھاتے سمجھاتے بڑی بوڑھیاں انھیں کوسنے دینے لگیں۔

شبو پھوپھو تھیں بھی تو پریوں جیسی' ایسے لگتا انھیں شیشے سے بنایا گیا ہے۔ اتنی خوبصورتی سے تیار ہوتیں' ایسا دلکش لباس پہنتیں...... جہاں سے گزر جاتیں' خوشبوئیں بکھیر جاتیں۔ انھیں

میلے کپڑوں میں تو کبھی کسی نے دیکھا ہی نہ تھا۔ ہر وقت بنی سنوری، بجی سجائی رہتیں، مانو ہاتھ لگانے سے میلی ہو جائیں گی۔

میں بھاگ بھاگ کے شبو پھوپھو کے کام کیا کرتی تھی۔ گویا میں ان کی منظورِ نظر تھی اور اس بات پر فخر بھی کرتی تھی۔ میں اگرچہ بہت چھوٹی تھی مگر وہ اپنے دل کی باتیں میرے ساتھ کر لیتی تھیں۔ کبھی کبھی میں بھی کوئی لایعنی سا سوال کر دیتی تھی......

''پھوپھو، یہ یونانی شہزادہ کیسا ہوتا ہے......؟''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتیں...... ''پگلی تو کیا سمجھے گی...... ایسا جیسا تصویروں میں ہوتا ہے۔''

''مگر تصویروں سے تو شادی نہیں ہوتی پھوپھو!''

''شادی کے وقت شہزادے تصویروں سے نکل آتے ہیں''...... وہ برابر ہنسے جاتیں۔ گویا کوئی انجانا ہاتھ انھیں گدگدا رہا ہے۔ اور جب ہنستے ہنستے ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تو وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں صاف کر کے کہتیں......

''مانو! میں شبنم ہوں۔ شبنم ہمیشہ خوبصورت پھولوں کے چہروں پر گرتی ہے۔ شبنم خوشبودار پھولوں سے محبت کرتی ہے۔ اس لیے میرے لیے کوئی آفاقی شہزادہ ضرور آئے گا۔''

ان کی آنکھوں میں یقین کے چراغ جلنے لگتے۔ راتوں کو موتیا کی کلیاں پہن کر چاند کی طرف دیکھتی رہتیں، جیسے چاند کے طشت میں سے شہزادہ برآمد ہوگا اور اِن پر عاشق ہو جائے گا۔

اور بڑی بوڑھیاں کہتیں...... ''اس پر عنقریب آسیب کا اثر ہو جائے گا...... چمٹ جائے گا کوئی اس کو...... جوانی دیوانی ہوتی پھرتی ہے......''

پھر کرنا خدا کا یوں ہوا کہ شبو پھوپھو کے لیے دُور دراز سے ایک رشتہ آگیا، یعنی سمندر پار سے...... سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے، اور سازش یہ کی کہ اب کے لڑکا دکھایا نہ جائے۔ بس چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کر دیا جائے۔ شبو پھوپھو چیختی چلاتی، برتن توڑتی پھوڑتی رہ گئیں۔ ہاں ہوگئی۔ شادی کی تاریخ طے ہوگئی۔ دعوت نامے تقسیم ہو گئے۔ اور عجیب بات یہ ہوئی کہ دولہا بھی شادی سے چار دن پہلے پاکستان آیا۔ ایسی بَری آئی کہ سب دنگ رہ گئے...... امپورٹڈ کپڑے اور ہیرے

موتیوں کے سیٹ۔ بھی کہنے لگے ارے یہ تو شہزادی ہے شہزادی، یہ تو شروع دن سے اور طرح کی تھی' جیسی نیت ویسی مراد۔ جب شبو پھوپھو کو دُلہن بنایا گیا تو واقعی وہ شہزادی نظر آنے لگیں۔ اتنے بھاری بھرکم کپڑے اور اتنے زیادہ گہنے کاہے کو اُنھوں نے پہنے تھے۔ میں نے دیکھا، اُس روز شبو پھوپھو کی آنکھوں میں ایک کیف اُتر آیا تھا اور ان کا چہرہ خوابوں کا آئینہ بن گیا تھا۔ وہ ایک دم شانت اور مطمئن نظر آرہی تھیں۔ گویا تقدیر کے فیصلے کو اُنھوں نے قبول کرلیا تھا۔

پھر جب دولہا کو آرسی مصحف کے لیے اندر لایا گیا۔ اور اس نے چہرے سے سہرا ہٹایا۔ تو گھر والوں کے سانس رکنے سے لگے۔ یوں تو سب کو معلوم تھا، تنزانیہ میں رہتا ہے، مگر ایسا تو وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ وہ کالا بھجنگ' موٹا اور بھدا ہوگا۔ کسی سیانے نے آرسی مصحف ہونے ہی نہیں دیا، جلدی جلدی رخصتی کردی' اور اللہ کا شکر ادا کیا۔

ہر کوئی جانتا تھا کہ تقدیر اپنا وار کر چکی ہے۔

ہم بچوں نے تو یہی سنا کہ سہاگ رات جب دولہا نے آکر شبو پھوپھو کا گھونگھٹ ہٹایا' اور شبو پھوپھو نے بند آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا تو چیخ مار کر ایسی بے ہوش ہوئیں کہ صبح تک ہوش ہی نہیں آیا۔ کسی نہ کسی طرح ولیمے کی رسم ادا کردی گئی۔ مگر جب بھی دولہا ان کے قریب جاتا، وہ بے ہوش ہو جاتیں۔ تیسرے دِن سسرال والے انھیں میکے چھوڑ گئے۔ یہ کہہ کر کہ دُلہن پر کوئی آسیب ہے، آپ اس کا علاج کرائیں!

گھر کے بزرگ تو پہلے ہی اس واہمے میں مبتلا تھے۔ اب باقاعدہ گنڈے تعویذ ہونے لگے۔ دھونیاں رمائی جانے لگیں۔ پیر فقیر آنے جانے لگے۔ مگر کوئی ان کی بے ہوشی اور خاموشی کا سرا نہ پکڑ سکا۔ ایسی چپ ہوئیں کہ ٹکر ٹکر دیکھا کرتیں۔ آنسو بہاتی رہتیں۔ بات نہ کرپاتیں۔ رہی سہی کسر علاج معالجے کے تجربوں نے پوری کردی۔

سنا ہے ان کا دولہا ایک ماہ بعد واپس چلا گیا اور سسرال نے کہلا بھیجا تھا، جب دُلہن ٹھیک ہو جائے گی اسے بھی بھیج دیں گے۔ مگر دُلہن نے شاید ٹھیک نہ ہونے کا تہیہ کرلیا تھا۔ اب تو بات ڈاکٹروں کے بس میں بھی نہ رہی تھی۔ ہم سب سکول سے آکر دیکھا کرتے، سفید

کپڑوں میں ملبوس ایک لاش بستر پر پڑی ہے۔ کبھی پیپل کے پتوں کو گھور رہی ہے اور کبھی آسمان کو کھوجتی رہتی ہے۔ ایک سال بعد سنا کہ ان کے دولہا نے دوسری شادی رچالی ہے۔ اب تو گھر والے بھی شبو پھوپھو سے بیزار نظر آتے تھے۔ پتہ نہیں شبو پھوپھو کو کیا ہوا تھا۔ جیسے صابن کی ٹکیہ پانی کے ٹب میں پڑی پڑی گھل جاتی ہے، اس طرح گھل رہی تھیں۔

پھر ان کی آزمائش ختم ہوگئی، وہ چلی گئیں...... جانے میں اُنھوں نے پورے تین سال لیے...... سارا دوش اس پیپل کو دیا گیا۔

میں ہائی سکول میں پہنچ گئی تھی۔ مجھ پر خاص نگاہ رکھی جاتی کیونکہ میں شبو پھوپھو کی چہیتی تھی اُور ان کی صحبت میں رہتی تھی۔ دیکھتے دیکھتے وقت ہماری ساری کھیپ کو اس موڑ پر لے آیا۔ باری باری سب لڑکیوں اور لڑکوں کی شادیاں ہوگئیں۔ یوں ہمارے گھرانے میں اندر ہی اندر شادیاں ہو جاتی تھیں بلکہ بچپن میں ہی نام لے لیے جاتے تھے۔ اسے بھی حسنِ اتفاق کہیے کہ شبو پھوپھو کی طرح میرے جوڑ کا کوئی لڑکا خاندان میں نہ ملا اُور میرے لیے بھی باہر سے بَر تلاش کیا گیا، حالانکہ میں شبو پھوپھو کی طرح حسین نہیں تھی۔ نہ مجھ میں بانکپن تھا۔ میرا رنگ پکا سانولا تھا، پھر بھی گھر والوں کو مجھ سے دھڑکا ہی لگا رہتا تھا۔

ایک لڑکا پسند آگیا اُور میری بات ٹھہر گئی۔ گھر میں شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ہمارے جیسے روایتی گھروں میں شادی کی ہلچل زندگی کی علامت ہوتی ہے۔

باوجود اس کے کہ میں ایک عام سی شکل کی لڑکی تھی، خواب تو میں نے بھی دیکھ رکھے تھے...... محبت کا تو مجھے بھی انتظار تھا۔ اپنے ساجن کے دل میں تو میں بھی رہنا چاہتی تھی...... اس لیے جب مجھے حجلۂ عروسی میں بٹھایا گیا تو میں اپنے دل کی دھڑکنیں اپنے کانوں سے سن رہی تھی...... ایسا اختلاج تھا کہ دل سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔

میرا دولہا اندر آیا...... اس نے میرا گھونگھٹ ہٹایا...... میں نے اُسے نظر بھر کر دیکھا اور پھر نظر جھپکنا بھول گئی...... شاید ایسا ہوتا ہوگا یونانی شہزادہ، جس کا ذکر شبو پھوپھو کرتی تھیں...... بانکا چھبیلا جسے دیکھتے ہی جی نہال ہو جائے...... وہ تو غالباً شبو پھوپھو کے لیے بنایا گیا تھا۔ مگر

شبو پھوپھو تو اس کا انتظار نہ کر سکیں...... میں مبہوت سی بیٹھی تھی، نہ جانے کب وقت وہ باہر نکل گیا...... پھر میرے کانوں میں آوازیں آئیں...... وہ اپنی ماں سے اونچی آواز میں کہہ رہا تھا......

''امی آپ کی نظر کمزور تھی...... میرے لیے سارے شہر میں آپ کو یہی کالی کلوٹی اور ٹھگنی لڑکی ملی تھی......؟''

ارے...... میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ میں کالی کلوٹی اور ٹھگنی کہلائی جاؤں گی...... لوگ تو مجھے بڑی پُرکشش لڑکی کہتے تھے اور میرے سگھڑپن کے قصے تو خاندان بھر میں مشہور تھے۔ اور سب بڑے کہتے تھے...... ''خوش قسمت ہو گا وہ گھر جس کی بہو تم بنوگی!''

مگر سہاگ رات کے چھپر کھٹ پر تو...... صرف صورت کا چراغ ہی جلتا۔ ...... ایک رات کی مسافت ہر چراغ کے نصیب میں نہیں ہوتی۔

اس کی ماں نے اسے سمجھا بجھا کر اندر بھیج دیا...... اندر تو ساری بتیاں گل ہوگئیں تھیں...... سارے پھول مرجھا گئے تھے......

شبو پھوپھو کہا کرتی تھیں...... بھلے ہی وہ میری پروا نہ کرے مجھے نہ پوچھے مگر ہو وہ شہزادوں جیسا خوبرو اور بانکا چھبیلا......

شبو پھوپھو کو کیا پتہ کہ ذات کی نفی کیا ہوتی ہے...... ٹھکرائے جانے کا کرب کیا ہوتا ہے...... بھیک میں ملی ہوئی توجہ کتنی اذیت ناک ہوتی ہے...... اور خود پسندی کا تیر کہاں تک گھائل کرتا ہے......

مجھے اس بات کا دکھ نہیں کہ پہلی رات کے بعد وہ میرے قریب نہیں آیا، دکھ یہ ہے کہ جب اس نے مجھے چھوڑنا ہی تھا تو مجھے داغ دار کیوں کیا......؟ ایک رات کی بخشش نے مجھے ایک بیٹا تو دے دیا...... مگر میرا زندہ رہنے کا حق بھی چھین لیا......

تقدیریں کس پیمانے پر لکھی جاتی ہیں، میں نہیں جانتی۔ میرا تو کوئی مطالبہ بھی نہ تھا' کوئی شرط بھی نہ تھی۔ میں تو زمانے کے دستور میں پلی پلائی لڑکی تھی۔ اور دستور کے مطابق بس گھر بسانا چاہتی تھی، گھر بھی قسمتوں کے ساتھ بستے ہیں۔

میں بھی جب میکے آئی تھی تو اس پیپل کے تنے سے لپٹ لپٹ کر خوب روئی تھی۔ اور مجھے بھی چاندنی راتوں میں چاند کو گھورنے کا عارضہ ہو گیا تھا۔ چاند کی بڑھیا اب مجھے اچھی نہیں لگتی تھی۔ کبھی کبھی یوں لگتا کہ چاند کی پالکی میں سے ایک مکروہ صورت مرد نکل آیا ہے۔ اور شبو پھوپھو کو گھسیٹ رہا ہے...... اور کبھی اس چاند میں سے ایک یونانی شہزادہ نکل آتا ہے اور میرے بدن پر ہنٹر برسانے لگتا ہے۔

مجھے اپنے آپ یقین آ گیا کہ میں آسیب زدہ ہوں۔ اور میری زندگی کا اور کوئی مقصد نہیں سوائے اس کے کہ میں گھر بھر کی خدمت کروں...... بھانڈے مانجھوں اور اپنے اکلوتے بچے کی پرورش کروں۔ جو ہو بہو اپنے باپ کی تصویر تھا۔ اور جس کے لیے مجھے جینا تھا اور گھونٹ گھونٹ زہر پینا...... تھا زمانہ کتنی جلدی بیت گیا...... زمانہ تو بیتنے کے لیے ہوتا ہے...... لیل ونہار کی گردش ہی سب سے بڑی سچائی ہے...... میں اب ساٹھ سال کی ہو گئی ہوں...... میرا چہرہ، میری طبیعت، میرے اردگرد ہر چیز بدل گئی ہے...... مگر یہ پیپل، یہ آج بھی ویسا ہی ہے...... اس میں ذرا فرق نہیں آیا۔ اس کے پتے غیر محسوس طریق سے سرہلاتے رہتے ہیں۔ میں نور کے تڑکے نماز کے لیے اُٹھتی ہوں تو میری نظر سب سے پہلے اس پیپل پر جا پڑتی ہے۔ وہ گڈے گڑیاں، گوٹے کناری والے دوپٹے، رنگ برنگی دھجیاں، نہ جانے کہاں غائب ہو گئی ہیں۔ پیپل کی شاخیں بے رونق ہو گئی ہیں۔ اب محلے کی بچیاں دوپہروں میں پیپل تلے بیٹھ کر گڑیا گڈے کا بیاہ نہیں رچاتیں۔ اُنھوں نے بازاروں سے ربڑ کی خوبصورت اور بولنے والی گڑیاں خرید رکھی ہیں، اور انھیں شیشے کی الماریوں میں سجا دیتی ہیں۔ صاف کہتی ہیں...... کبھی گڈے گڑیا کا بھی بیاہ ہوتا ہے...... یہ بے وقوفی کی باتیں ہیں، کھلونے تو بس شوکیس میں سجانے کے لیے ہوتے ہیں، خراب کرنے کے لیے نہیں۔

لڑکیاں اُجلے فراک اور سفید جرابیں پہن کر پیپل سے دُور رہتی ہیں، کہیں ان کے کپڑے خراب نہ ہو جائیں۔ کیرم اور لڈو کھیلتی ہیں۔ ''کیڑی کاڑا'' اور ''لکن میٹی'' نہیں کھیلتیں۔ لڑکے بھی جوگرز پہن کر باہر میدانوں میں چلے جاتے ہیں، سب ہی کرکٹ کھیلنے لگے ہیں۔

اب یہ بچے مجھ سے کہانیاں سننے کا مطالبہ بھی نہیں کرتے۔ خود ہی کہانیوں کی کتابیں اور کامکس خرید لاتے ہیں۔ اور پھر پڑھنے کا شوق بھی زیادہ نہیں رہا۔ شام کو سب ٹیلی ویژن کے گرد بیٹھ جاتے ہیں۔ پیپل کے نیچے ایک نئی دُنیا پیدا ہو گئی ہے۔

میرا دل چاہتا ہے، میں بھی ان کو بھوت پریت سے ڈراؤں۔ ان کے گلے میں تعویذ ڈالوں۔ ان کو دم کر کے پانی پلاؤں۔

بھوت کا نام سن کر یہ ٹھٹھے لگاتے ہیں...... ”کس زمانے کی باتیں کرتی ہو دادی اماں......؟ بھوت صرف اگلے زمانے میں ہوتے تھے۔ آج کل تو 007 ہوتا ہے۔“...... تعویذ اُتار کر میرے گلے میں ڈال دیتے ہیں۔

میں چاہتی ہوں کہ میری بات کو پتھر کی لکیر سمجھا جائے۔ مگر میں تو خود اس گھر میں ایک مدھم لکیر بن گئی ہوں۔ میرے بیٹے نور الدین نے صاف کہہ دیا تھا۔ کہ وہ میری کالی کلوٹی بھتیجی کے ساتھ شادی نہیں کرے گا۔ وہ جرمنی گیا تو وہاں سے گوری چٹی میم لے آیا، جس کے رہنے کے لیے اس نے پوش علاقے میں ایک مغربی طرز کا گھر بنالیا ہے۔ میری مجبوری ہے، میں چکنے فرش والے گھر میں نہیں رہ سکتی۔ اس کی مجبوری ہے کہ وہ کچے صحن والے آسیب زدہ گھر میں نہیں رہ سکتا، جو اَب آثارِ قدیمہ بنا کھڑا ہے۔ اب اس گھر میں وہی لوگ رہ گئے ہیں جو آثارِ قدیمہ کا حصہ ہوتے ہیں۔

اس پورے محلے کا کلچر بدل گیا ہے۔ ہر گھر میں سے کوئی بچہ بیرونِ ملک گیا تھا۔ واپسی پر وہ یا تو کسی فیشن ایبل علاقے کا مکین بن گیا ہے یا اپنے پرانے گھر کو توڑ کر دو منزلہ یا تین منزلہ کنکریٹ کے محل میں منتقل کر لیا ہے۔ پہلے ہمارے گھر کے صحن میں سے کسی کی چھت نظر نہ آتی تھی مگر اب آس پاس اتنے بلند گھر سر اُٹھائے کھڑے ہیں کہ ہمارے صحن کی کوئی بات راز نہیں رہ سکتی۔ یہ اور بات کہ اب اس صحن میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی فوج ہی نہیں ہے۔ نہ پتھروں کے ساتھ باندھ کر پیپل کے توسط سے پرچیاں پھینکی جاتی ہیں۔ نہ چاندراتوں میں موتیا کی اوٹ سے بھوت اور پریاں نکلتی ہیں۔

میں کھاٹ پر پڑی۔ چھوٹے بچوں کی آمد کا انتظار کرتی رہتی ہوں۔کوئی آئے...... کوئی دادی کہے کوئی نانی پکارے...... کوئی تو آئے...... کیسا وقت آن پڑا ہے کہ زندگی' اولاد کی اولاد کی چاپ سننے کو ترستی رہتی ہے۔

میری زندگی کے سارے مہ وسال پیپل کے اِن پتوں پر رقم ہیں جن کی تھاپ سنتے سنتے ،مَیں جوان ہوئی اور پھر بوڑھی ہوگئی۔اب تو اس کے اَندر بسنے والے جن مجھے اپنے دوست لگنے لگے ہیں۔کبھی کبھی مَیں یہاں کھاٹ ڈال کر لیٹ جاتی ہوں اور جنوں سے باتیں کرتی رہتی ہوں۔یوں لگتا ہے،اندھیرے کی گپھاؤں میں بیٹھے ہوئے جنات میری باتیں غور سے سن رہے ہیں اور باقاعدہ سر ہلا رہے ہیں۔کل محلے میں ایک عجیب طوفانِ بدتمیزی اُٹھا، جب کمیٹی کے ممبران نے مشترکہ فیصلہ دے دیا کہ اب اس پیپل کو کاٹ دینا چاہیے...... یہ محلے میں گندگی پھیلاتا ہے...... سورج کی دُھوپ کو روکے رکھتا ہے...... اور فضا کو آلودہ کر رہا ہے!

ہر کوئی کہہ رہا ہے' اس پیپل کو کاٹ دو۔کارپوریشن کو عرضیاں دی جا رہی ہیں' راستے اور سڑکیں صاف کی جا رہی ہیں۔

میرا جی اندر سے ڈوب رہا ہے۔اگر یہ پیپل نہ رہا تو میں اس کچے صحن میں زندگی کے باقی ماندہ گنے چنے دن کس کے سہارے گزاروں گی......؟

میں انہیں کیسے سمجھاؤں کہ یہ پیپل فضا کو آلودہ نہیں کر رہا بلکہ یہ تو ہر گھر کی آلودگی اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے!

☆☆☆

افسانچہ

سبزہ اور پتھر

کبھی تم نے غور کیا پتھریلی زمین میں پتھروں کی اوٹ سے سبزہ نکل آتا ہے۔
پتھر ایک ایسی چیز ہے جس کی سطح پر ایک قطرہ پانی بھی نہیں ٹھہر سکتا......
اور لحد......
جو مردہ تن کی امین ہوتی ہے۔ اس کے اندر سے بھی اپنے آپ سبزہ نکل آتا ہے......
پھوٹ کے آتا ہے......
اس کو تو سرسبز ہونے کی کوئی دُعا بھی نہیں دیتا......
ایک تم تھے......
زندگی بھر میں تمھاری اوٹ سے کس سبزے کسی گلاب کے پھوٹنے کی تمنائی رہی......
کیا تم پتھر اور قبر سے بھی گئے گزرے تھے......؟

☆☆☆

ملبا

بجری میرے پاؤں تلے چیخی' پتے میرے پاؤں تلے چرمرائے۔ یہ آوازیں کسی طور موسیقی سے مشابہ نہیں تھیں۔ میں نے نظر گھما کر سارے پارک کو دیکھا، ہمیشہ کی طرح کا ایک منجمد موسم تھا۔ ہر شے اپنی جگہ موجود تھی مگر سارا منظر گویا تھکا تھکا سا تھا۔

یہ وہی پارک ہے' جس نے میرے اندر روشنی کا ایک جھرنا اگل دیا تھا۔ یہیں سے میں نے اپنی ذات کی شناخت پائی تھی۔ یہیں پر مجھے اپنے دل کی دھڑکن کی آواز پہلی بار سنائی دی تھی۔ اسی کہکشاں پر میری آنکھ میں ستارے اُترے تھے۔ میں نے موسموں کے آئینے میں دل کی جولانیوں کا عکس دیکھا تھا۔

ہمارے شہر میں بہت جدید قسم کا پارک بنا تھا، جس نے لوگوں کے اندر جاگنگ کرنے کا ایک نیا شعور پیدا کر دیا تھا۔ اُن دِنوں میں نے ایک ٹریول ایجنسی میں ملازمت کر لی تھی۔ کرسی پر مسلسل بیٹھے رہنے سے میری ریڑھ کی ہڈی کے نچلے مہرے میں درد رہنے لگا تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے ہدایت کی کہ میں روزانہ کم از کم پانچ کلومیٹر پیدل چلا کروں' ورنہ نتائج اور بھی سنگین ہو سکتے ہیں۔ یوں میں نے بھی لوگوں کی دیکھا دیکھی پارک میں جانا شروع کر دیا۔ پارک یوں تو شہر سے باہر تھا مگر اس کے ایک کونے کو فیشن ایبل آبادی کا سرا لگتا تھا۔ اس جاگنگ ٹریک پر بھاگتے ہوئے ایک خوبصورت سے گھر کا گیٹ' پارک کی دیوار کو لگتا تھا۔ یوں آتے جاتے ہوئے اس سجے سنورے لان اور پھولوں سے لدے کنج پر خواہ مخواہ نظر اُٹھ جاتی۔ گھر بھی ایسا تھا جیسے کسی نے کبھی خواب میں یہ نقشہ دیکھا ہو۔ میں جب بھی اس گیٹ کے آگے سے گزرا کرتی، دُور تک

اس گھر کو دیکھتی جاتی......

ایک دن میں ٹھٹھک گئی!

وہاں ایک بت ایستادہ تھا!

کیا وہ بت تھا۔ گیٹ کو ایک ہاتھ سے تھامے وہ کھڑا تھا...... جیسے وہاں کسی نے کوئی مجسمہ گاڑ دیا ہو۔ میں اُسے دُور سے دیکھتی آئی' نزدیک تک دیکھتی رہی...... پھر جاتے جاتے بھی مڑ مڑ کر دیکھا۔ اس میں حرکت پیدا نہ ہوئی۔ اتنا شاندار مرد میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ سارا راستہ میں یہی سوچتی رہی کہ کیا مرد بھی اتنے دلکش ہوتے ہیں کہ بار بار اِن کی طرف نگاہ اُٹھ جائے۔ ایسا حسن تو اللہ نے عورت کو عطا کیا ہے۔

دوسرے روز میں آئی تو وہیں کھڑا تھا۔ میں نے اسے آنکھیں جھپکا جھپکا کر دیکھا کہ کیا وہ سچ مچ کا آدمی ہے یا کوئی ڈمی ہے۔ شکر ہے دوسرے دِن اس نے جوگرز پہنے ہوئے تھے۔ سفید جینز اور سفید ٹی شرٹ میں وہ آسمان سے اُتری ہوئی مخلوق لگ رہا تھا۔ پیشتر اس کے کہ میں اس کے قریب پہنچوں اس نے گیٹ ہاتھوں سے چھوڑ دیا اور دوسرے ٹریک پر جاگنگ کرنے لگا۔ تب بھی میں اسے دُور تک دیکھتی گئی اور سوچتی رہی۔ خوبصورت لڑکیوں کو جب مرد مڑ مڑ کر دیکھتے ہیں تو وہ دل میں بہت اتراتی ہیں اور اس دیدہ سراہی کو اپنا پیدائشی حق سمجھتی ہیں۔ پتا نہیں جب وجیہہ و شکیل مردوں کو لڑکیاں یوں دیکھتی ہوں گی تو وہ دِل میں کیا سوچتے ہوں گے؟

اس کو روز دیکھنا ایک عادت سی بن گئی۔ اس کے بارے میں سوچنا ایک سوچ سی بن گئی۔ اس کے گھر کو تعریفی انداز میں دیکھنا نظر کی تمنا سی بن گئی۔

وہ کبھی تو مجسمہ بنا گیٹ کے ساتھ لگا پارک میں آنے جانے والوں کا نظارہ کر رہا ہوتا۔ کبھی سفید براق کپڑے پہنے' جاگنگ ٹریک پر دوڑ رہا ہوتا...... کبھی دھیمے دھیمے چلتا ہوا کسی دوست سے باتیں کرتا میرے قریب سے گزر جاتا...... اس کے ساتھ ہی خوشبو کا ایک جھونکا میرے نتھنوں سے ٹکراتا۔ وہ بڑی اچھی خوشبو استعمال کرتا تھا۔ کبھی مجھے آنے میں دیر ہو جاتی تو وہ اپنے گھر کے لان میں بیٹھا اخبار پڑھتا نظر آ جاتا۔

کسی شخص کا ہر روز نظر آنا کوئی انوکھی بات تو نہ تھی مگر پتا نہیں اس شخص میں کیا بات تھی کہ مجھ جیسی آئیڈیل پرست لڑکی اسے نظر بھر کر ضرور دیکھتی۔ اس کا سراپا' قد و قامت' اس کے نقش و نگار' اس کی آنکھیں، جیسے دنیا کو اپنے اندر سموئے بیٹھی ہوں۔ صحت مند چہرہ' جس کے اندر سے گلابیاں جھانکا کرتیں۔

اب یوں ہونے لگا کہ وہ بھی مجھے دیکھتا......!

دیکھنا دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک تو ایسے' جیسے ہر روز سب لوگ آتے جاتے' اُٹھتے بیٹھتے' سفر کرتے' کام کرتے...... آس پاس دیکھتے رہتے ہیں۔ دوسرا دیکھنا ایسا ہوتا ہے' جیسے نظر نے چاہ کی ہو۔

پھر ایسا ہونے لگا کہ وہ مجھے دیکھتا تو دھیرے سے مسکرا دیتا۔ انوکھی مسکراہٹ تھی اس کی۔ ہونٹ تو وا نہ ہوتے مگر آنکھیں مسکرانے لگتیں' رخساروں پر تبسم کا نور اُبھر آتا...... یہ بڑی خطرناک مسکراہٹ ہوتی ہے۔

مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ بعض مرد مسکراتے ہیں تو کلیجہ نکال لیتے ہیں۔ پتا نہیں اُس نے اِس طرح مسکرانا کہاں سے سیکھا تھا' یا شاید یہ مسکراہٹ نسل در نسل چلتی ہوئی اس تک اپنے آپ پہنچ گئی تھی......!

میں بھی جواباً مسکرانے لگی۔

مَیں' جو باغیانہ خیالات کی جانشین بنی پھرتی تھی' مستقل مردوں کی عادات و سکنات کے بارے میں سوچنے لگی۔ میں جوں جوں غور کرتی توں توں میری دلچسپی بڑھتی جاتی۔

میری کمر کو آرام آ گیا تھا مگر ایک تجسس نے مجھے ہر روز پارک آنے پر اکسائے رکھا۔ مجھے اس کے گیٹ کے آگے سے گزرنا اچھا لگتا' بے اختیار اس کے گھر کے اندر دُور تک دیکھنا اچھا لگتا' اس کے گھر کو دیکھ کر یہ سوچنا کہ وہ اندر ہوگا اور کیسے رہتا ہوگا؟ پھر اس کے کمروں میں گھومنا اور اس سے بھی آگے سوچنا اچھا لگنے لگا۔

ایک بار مجھے شہر سے باہر جانا پڑا۔ میں چار دن پارک میں نہ جا سکی۔ پانچویں دن گئی تو وہ گیٹ کے ساتھ مجسمہ بنا کھڑا تھا۔ اسے اس طرح کھڑے دیکھ کر میرا دل پہلی بار زور سے اچھلا' مجھے اپنے دل کی یہ رفتار اجنبی سی لگی۔

وہ گیٹ چھوڑ کر آگے آ گیا اور جلدی سے بولا:

''آپ چار دن نہیں آئیں...... خیریت؟''

یہ کہہ کر وہ خود کھسیانا سا ہو گیا...... اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں چلتی رہی' گو میں نے اپنی رفتار دھیمی کر لی تھی۔ وہ بھی قدم ملا کے میرے ساتھ چلنے لگا۔

''اس کا مطلب ہے آپ دن گنتے رہے ہیں۔'' میں نے قدم جما کر کہا۔

اس کے چہرے پر ہلکا گلابی رنگ چھا گیا' جیسے سورج پر شفق چھا جائے۔ مجھے اس کے چہرے کا یہ رنگ بہت بھایا۔ ایک بہت ہی شرمیلی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ابھری' جیسے کسی نے اس کی چوری پکڑ لی ہو۔

''اصل میں پچھلے ایک سال سے میں آپ کو باقاعدگی کے ساتھ آتے جاتے دیکھ رہا ہوں...... کسی کو روز دیکھنے کی عادت سی پڑ جاتی ہے نا۔''

اوہ...... تو اس کی نظر کو بھی میری طرح عادت سی پڑ گئی تھی...... ٹھیک کہتے ہیں لوگ' نظر کو بھی نظر سے راہ ہوتی ہے...... میں اپنی خوشی دبانا چاہتی تھی۔ میں نے کہا:

''میں شہر سے باہر گئی ہوئی تھی۔''

ابھی سلسلہ کلام آگے چلتا کہ مخالف سمت سے اس کا ایک دوست آ کر اس سے بغلگیر ہو گیا۔ میں آگے بڑھ گئی۔

واقعی مجھے اس پارک میں آتے ہوئے ایک برس ہو گیا تھا؟ مجھے تو خیال نہیں آیا۔ اس نے کیوں کر یاد رکھا۔

ایک سال...... یعنی بارہ مہینے......؟ یعنی ۳۶۵ دن......؟ ہم نے ایک دوسرے کو مسلسل دیکھا۔ دیکھ دیکھ کر اور مسکراہٹوں کے تبادلے میں گزار دیا۔

یہ آنکھ جو ہوتی ہے نا' یہ بندے کو چور بنا کے چھوڑتی ہے...... جس طرح وہ مجھے دیکھا کرتا' میرے سارے جسم میں ننھے ننھے جگنو چمکنے لگتے۔ جس طرح وہ مسکراتا' مانو کوئی دل کے آس پاس سرخ گلابی پتیاں سی گرا رہا ہو۔ وہ تو چپ ہی رہتا تھا مگر نہ جانے کیوں اس کے چہرے کا اک اک نقش شعر بولتا رہتا۔ پتا نہیں اس میں یہ طلسمی طاقت کیسے آئی تھی......

گونگوں کی کیفیت جان لیوا ہوتی ہے......

گہری چپ مقفل دروازے توڑ دیتی ہے......

قطرہ قطرہ گرتا پانی پتھر کے جگر میں سوراخ کر دیتا ہے......

نہ جانے کب...... نہ جانے کیسے میں نے اپنے دل کے اندر وہ دیوانگی محسوس کی' جسے چاہت کہتے ہیں......

چاہت کیا ہوتی ہے؟

اس کو دیکھنے کی آرزو......

اس کو چھونے کی تمنا......

اس کو پا لینے کا خواب......

اف قصور آنکھوں کا تھا' سزا دل کو ملی۔

کاش! اس کے اندر مردوں والا عامیانہ پن ہوتا' نظروں میں ننگی بھوک ہوتی' گفتگو میں ہوس کی چاشنی ہوتی' مسکراہٹ میں طلب کے اشارے ہوتے۔ پھر میں اس سے دور بھاگ جاتی۔ بعض مرد ملتے ہی اپنے مدعا کا اشتہار بن جاتے ہیں۔

وہ اتنا پُراسرار کیوں تھا۔

جیسے شام کے سنہرے لمحوں میں آہستگی کے ساتھ آسمان کے سرمئی کناروں سے اتر کر خوابوں کی وادی میں بھٹک رہا ہو' موسم کی ساری ملاحتیں اس کی ذات کے اندر سمٹ آئی ہوں۔

اور مجھے بھی تو ساری دنیا ایک دم حسین نظر آنے لگی...... میں جو دل جلوں کی سالار بنی پھرتی تھی' مجھے یہ پارک محبت کا ایک معبد نظر آنے لگا۔

درخت ہمہ وقت جھومتے اور مسکراتے سے لگتے۔ سبز گھاس مخمل کا ٹکڑا لگتی۔ پھولوں کے مکھڑے روشن روشن لگتے۔ پارک میں ہمہ وقت، چیختے چلاتے ہوئے بچے قدرت کے حسین پیغامبر لگتے۔ جھیل کا پانی میرے ساتھ باتیں کرتا رہتا۔

ان دنوں میری امی میرے چہرے کو غور سے دیکھا کرتیں۔ کوئی شے تھی جو میرے چہرے کے اندر سے جھانکا کرتی۔ امی ہی کیا دفتر میں بھی ہر کوئی مجھے دیکھ کر ٹھٹھک جاتا۔ یہ محبت کا اعجاز تھا۔ محبت انسان کو ہوشربا بنا دیتی ہے۔ آنکھوں میں ٹھنڈی بجلیاں بھر دیتی ہے۔ رخساروں کو گلاب کر دیتی ہے۔ ہونٹ ایک کیف بھری مسکراہٹ سے لدے رہتے ہیں۔ نہ جانے اتنی چاندنیاں جسم میں کہاں سے آ جاتی ہیں۔ دنیا کا ہر نظارہ بدلا بدلا نظر آتا ہے۔ طبیعت ایسی کہ جیسے ہواؤں کے ساتھ چاند چھونے میں مگن ہے۔ میں خود شیشہ دیکھ کر حیران ہوا کرتی۔ گو میرا شمار خوبصورت لڑکیوں میں ہوتا تھا مگر حسن کو آفت بنانے کا گُر صرف محبت کو آتا ہے۔ کسی کا دل میں سما جانا گویا وجود کے اندر ے خانے کا کھل جانا ہے!

ایک دن امی نے مجھ سے کہا: ''صبح کی سیر سے تمہاری صحت پر بہت اچھا اثر ہوا ہے۔''

''جی امی'' ...... میں نے لہرا کر کہا۔

''کمر درد کا تو آرام ہے نا؟'' امی نے پھر سلیقے سے پوچھا۔

''کب سے امی ...... میں تو اب بالکل ٹھیک ہوں'' یہ کہہ کر میں ٹھنکی۔

امی کی نگاہ ابھی تک کچھ تلاش کر رہی تھی، کیونکہ اولاد کو پڑھنے والی آنکھ صرف ماں کے پاس ہوتی ہے۔

''تم نے تو اب شام کو بھی جانا شروع کر دیا ہے۔ اب اتنی ورزش کی ضرورت تو نہیں، گرمی شروع ہونے والی ہے۔ زیادہ کمزور نہ ہو جانا۔'' امی، رسان سے اپنا پیغام وائرلیس پر چھوڑ کر اپنے کام میں مگن ہو گئیں۔

ہاں! میں نے شام کو باقاعدہ جانا شروع کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ بھی اکثر شام ہی کو نظر آتا تھا اور وہ چاہتا بھی تھا کہ میں شام کو آیا کروں۔ رفتہ رفتہ میں نے معمول ہی شام کا بنا لیا۔ دفتر سے

اُٹھ کر سیدھی اُدھر آ جاتی۔ مگر یہ کہ میں اوڑھنے پہننے کے معاملے میں بڑی لاپرواتھی۔ وہ نظر میں آیا تو میرے ملبوسات کے ڈیزائن اور رنگ بدلنے لگے۔ واہ کیا تبدیلی تھی!

امی نے دھیمے سے کہا تھا کہ گرمی شروع ہونے والی ہے۔ کیا واقعی موسم بدلنے والا تھا؟ میں بڑی حیران ہوئی' کیونکہ میرے اندر تو ایک مہکتا ہوا' مسکراتا ہوا' گلرنگ موسم آ کر ٹھہر گیا تھا۔

اندر کا موسم تمنا کا سرتاج ہو تو باہر کے موسم کا خیال کون کرتا ہے؟ یہ مئی کا مہینہ تھا۔ یہ مہینہ آنے والی گرمی کا اعلان کرتا ہے۔ لوگ ٹھنڈے کپڑے نکالنا شروع کر دیتے ہیں۔ سردی کے جانے پر شکر مند بھی ہوتے ہیں۔ پھر بھی مشتبہ باتیں کرتے ہیں۔ کتنا اچھا مہینہ ہے۔ میں دل میں سوچتی...... ٹھنڈی ہوا جب منہ کو چھو کے گزرتی ہے' خیال فوراً کسی کی طرف دوڑتا ہے۔ جون کا مہینہ آ گیا۔ ہر سال گرمی آتی ہے۔ ہر سال لوگ ایک جیسے فقرے کہتے ہیں۔ اف توبہ! اس دفعہ تو گرمی نے حد کر دی۔ مگر جون کی چلچلاتی دھوپ' مجھے پیار کی حدت میں ڈوبی لگتی۔ پسینہ کیا بہتا' خوشبو کا جھرنا پھوٹ بہتا۔ ایسے ہی پسینے کی خوشبو میں' اس کے سانسوں کی خوشبو رچی محسوس ہوتی۔ جولائی' مون سون کی برساتوں کا مہینہ ہے۔ پہلے میں بھی ایسے ہی کہا کرتی تھی۔ توبہ اس شہر میں برساتوں کے بعد کتنی گندگی ابھر آتی ہے۔ مگر اب کے جب سیاہ کالے بادل آسمان پر چھائے' کبھی ہلکا اور کبھی چھاجوں مینہ برسا تو اندازہ ہوا...... خوابوں کی صورت گری کے لیے برسات کی رم جھم کتنی ضروری ہے۔ سچی بات ہے' اگست کا مہینہ مجھے اچھا نہیں لگتا تھا' کیونکہ برسات کا سارا حبس اگست کے مہینے میں آ جاتا ہے۔ مگر مجھے حیرت تھی کہ مجھے ایک روز بھی حبس یا گھٹن کا احساس نہیں ہوا۔

جب ساون بھادوں کے بعد چبھتی سی دھوپ نکلی تو میرے من کے اندر اتنی ٹھنڈ تھی کہ میں اپنے کام کرنے میں توانائی محسوس کرتی رہی۔ گرمی کی شدتوں کو پار کر کے ستمبر کا مہینہ آتا ہے' گویا دو موسموں کے درمیان ایک پڑاؤ ہے۔ پتا نہیں ستمبر کی شامیں مجھے اداس کیوں لگا کرتی تھیں۔ شام کے پرندے بھی تھکے تھکے سے لگتے تھے' مگر پہلی دفعہ میں نے محسوس کیا کہ ستمبر موسم میں ایک غیر محسوس تبدیلی کس طرح سے لاتا ہے' ورنہ شدید تپش کے بعد شدید سردی' لوگ

کیسے برداشت کر پاتے۔ دنوں کو شاموں کے قریب لانے والا مہینہ ستمبر ہے۔

پھر میں نے اکتوبر کے مہینے کے بارے میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا۔ ایک دنیا، اکتوبر کو ''لورز ویدر'' کہتی ہے۔ میں اکثر حیران ہوتی تھی کہ اکتوبر عاشقوں کا مہینہ کیوں کر ہو گیا۔ اس بار جب اکتوبر آیا تو میں نے موسم کی ملاحتیں محسوس کیں۔ اس کی صبحیں معصوم بچے کے مقدس چہرے کی طرح ہوتی ہیں کہ دیکھتے ہی بے اختیار چوم لینے کو دل چاہے۔ اس کی دوپہریں نہ گرم نہ سرد...... لڑکپن کی طرح بے پروا، بے تکان۔ اس کی شامیں...... اف اس کی شامیں بہت ظالم ہوتی ہیں...... دوشیزگی کے الھڑ خوابوں کی مانند، تھوڑی تھوڑی خنک، تھوڑی تھوڑی چنچل، ٹھہر ٹھہر کے چلتی ہوئی ہوا اپنے آپ گلے سے لپٹتی رہتی ہے، فضا سہیلی بنی کان میں نشیلے قصے کہتی رہتی ہے۔ دل میں سوئی ہوئی وصل کی تمنا سرکشی سے سر اٹھاتی ہے۔ بس ہر سمت، ہر آن، محبوب کا جلوہ نظر آنے لگتا ہے۔ میں نے اکتوبر کا مہینہ بہت مشکل سے گزارا...... توبہ!

دل کو قابو میں رکھنا کتنا مشکل ہو گیا تھا۔ دل تو ساری کائنات میں بس ایک ہی منظر دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے اس مہینے میں تحفوں کے ذریعے دیوانگی کی حرکتیں بھی بہت کیں۔

نومبر آ گیا۔ اپنے کاندھوں پر میٹھی میٹھی سردی لے کر، دھوپ سے گزرتے تو دھوپ بری نہ لگتی، چھاؤں میں بیٹھتے تو چھاؤں تنگ نہ کرتی۔ اس مہینے میں جوانی کو گرم کپڑوں کی ضرورت نہیں ہوتی، گلابی گلابی شاموں میں جوانی اپنے ہی جسم کی آگ تاپا کرتی ہے۔ کبھی کبھی زکام ہو جاتا ہے۔ عشق کے موسم میں زکام جیسی بیماری کتنی رومانٹک لگتی ہے کہ نیم وا آنکھیں ایک اور ہی نشے میں ڈوبی رہتی ہیں۔

دسمبر شدید سردی کا موسم ہے۔ ساری آگ رضائی کے اندر آ جاتی ہے...... عجیب ہے یہ رضائی بھی...... گویا رضائی نہیں اوڑھی، خواب اوڑھ لیے ہیں!

مجھے اس بات پہ غصہ آیا کرتا تھا کہ لوگ جنوری میں نیا سال کیوں مناتے ہیں۔ مگر اب کے جو اس نے پھولوں کا بڑا گلدستہ اور ایک انتہائی دلکش کارڈ مجھے دیا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ دنیا میں نیا سال پہلی دفعہ آیا ہے۔ پارک میں علی الصبح کہرا پھیل جاتا۔ اس کہرے میں سے گزر

کر جانا' کہرے کے اندھے دھوئیں کو اپنے چہرے پر محسوس کرنا' اس کے گیٹ کے پاس جا کر اسے دیکھنا اور واپسی پر چہرے پر ننھی ننھی بوندیں لے کر واپس آنا' کتنا زندگی بخش کھیل تھا۔

فروری میں برساتیں ہوا کرتی ہیں۔ میں جب کالج میں پڑھتی تھی تو اکثر سوچتی کہ بھلا اتنی شدید سردیوں میں بارشوں کی کیا ضرورت ہے؟ صبح اٹھنا محال' کالج جانا مشکل' بازار میں جانا بوجھل' کیچڑ ہی کیچڑ سرِراہ بکھرا ہوا...... مگر اس مرتبہ میں نے ساری ساری رات جاگ کر برساتوں کی جھانجھن کو سنا ہے۔ شب کے پچھلے پہر جب بادل گرجتا ہے اور کہتا ہے: میں آ رہا ہوں' تو بجلی کی کڑک اسے راہ دکھاتی ہے۔ پھر یکلخت جھن جھن کی آوازوں کے ساتھ آسمان سے موتی زمین پر گرنے لگتے ہیں۔ یہ موتی گھروں کے بند دروازوں اور کھڑکیوں پر پڑتے ہیں تو برہا کی ماری کسی جوگن کے سارے گیت جاگنے لگتے ہیں۔ سناٹے میں بارش کی آواز' اس آواز کے ساتھ زمزمے گاتی اپنے دل کی آواز' اسی موسم میں برفانی ہوائیں چلتی ہیں جن کی آنکھیں محبت چھین لیتی ہے۔ اسی لیے وہ دیوانہ وار ہر دروازہ' ہر روزن بجاتی گزرتی ہیں کہ جانے ان کا محبوب کس در کے اندر محوِ خواب ہے' یا شاید میں ان ہواؤں کے ساتھ باؤلی ہوئی پھرتی تھی۔

یوں مارچ کا مہینہ آ گیا...... یہ بڑا روشن اور چمکدار مہینہ ہوتا ہے۔ لڑتی جھگڑتی ہواؤں اور برف کے ظالم تودوں میں صلح کروا دیتا ہے۔ خزاں کے ستم سے برہنہ درختوں اور سڑے ہوئے پودوں کو نویدِ زندگی دینے لگتا ہے۔ بڑا عجیب موسم دیکھا میں نے' جنوری اور فروری میں ایک پت جھڑ کا موسم گزرا تھا۔ پتے نیم مردہ حالت میں زمین پر گر کر ڈھیر ہوتے جا رہے تھے۔ ہواؤں کے رنگ زرد تھے۔ موسم مٹیالا ہو گیا تھا۔ صریحاً وہ ہجر کا موسم تھا مگر جس دل پر ایک عرصہ سے ہجر کے آرے چل رہے ہوں' اسے تو وہ موسم بہت بھائے گا۔ پت جھڑ تو پارک کے اندر بھی تھی' مگر اداسی کہیں نہیں تھی۔ میری آنکھیں مصور کی ہو گئی تھیں۔ ٹنڈ منڈ درختوں میں دل اٹکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کو دیکھ لینا نظر کی معراج جو تھی' پر یہ سارا منظر نامہ مارچ نے آ کر بدل دیا۔

بہار تو ہر سال ہی آتی تھی۔ ہمارا شہر پھولوں سے بھر جاتا تھا۔ پھولوں کو دیکھ کر دل میں یوں بھی ترنگ اٹھتی ہے' لیکن اس مارچ میں ہر پھول میری جوانی کی شبیہ بنا کھڑا تھا۔ ہر پھول

کی خوشبو میں میری سانسوں کی مہک رچ بس گئی تھی۔ اس کا لان گلاب کے پھولوں سے لدا کھڑا تھا۔ وہ پھول وہاں سے گزرتے ہوئے مجھے سلام کرتے تھے۔

اپریل ایک چور مہینہ ہے۔ بہار کی باقیات کو چرا کر رکھ لیتا ہے اور ہمیشہ مسکراتا لہلہاتا نظر آتا ہے۔ سال کے بارہ مہینے گویا میرے دل سے ہو کر گزر رہے تھے اور تو اور میں نے ان مہینوں کی چاندراتوں کو باقاعدہ محسوس کیا تھا۔ پھر تو یوں ہونے لگا کہ چودھویں کی رات مجھ پر ایک ہذیانی' جنونی کیفیت طاری کر دیتی۔ میں گھر سے بہانہ بنا کر' نوکر کو ساتھ لے کر نکلتی' اسے گیٹ پر چھوڑتی اور دوڑ کر اس کے گھر کے آگے آ جاتی۔ میں نے اسے کہہ رکھا تھا کہ وہ جہاں کہیں بھی ہو چاند کی چودھویں میں اپنے لان میں کھڑا ہوا نظر آئے۔ وہ ایسا ہی کرتا۔ ٹھیک کہتے ہیں لوگ' چودھویں کی رات کچھ لوگوں کو دیوانگی کے دورے پڑتے ہیں۔ یہ دیوانگی نہیں تو کیا تھا کہ بس دوڑتے ہوئے آنا۔ ایک سایہ سا چاند کے طبق کے نیچے دیکھنا اور پھر لوٹ جانا...... اف کوئی طاقت تھی...... کوئی توانائی تھی...... میں اڑتی پھرتی تھی' پھلانگتی پھرتی تھی۔

مجھے یوں محسوس ہوتا کہ محبت دنیا کی سب سے زیادہ طاقتور چیز ہے' تبھی تو کچے گھڑے کو کشتی بنا دیتی ہے۔ دودھ کی نہر کھودنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ ریگستانوں میں راستہ تلاش کرنا سکھاتی ہے۔ ایٹم بم' ٹینک' بارود' میزائل کوئی شے محبت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ بہت ہنسا کرتی تھی میں' یہ لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کی فلمیں دیکھ کر' اکثر سہیلیوں سے کہا کرتی اگر یہ ظالم سماج ایک دن لیلیٰ مجنوں کی شادی کر کے انہیں ایک کمرے میں بند کر دیتا تو ایک ماہ کے بعد ان کی طلاق کی نوبت آ جاتی۔ سب بکواس ہے عشق و محبت!

اب مجھے اپنے خیالات پر افسوس ہوتا۔ محبت تو ایک عرفان میں ڈوبی بے خودی ہے۔ ران کے گوشت کے کباب بنوا سکتی ہے۔ ایک کو مار پڑے تو دوسرے کے جسم پر داغ پڑ سکتے ہیں۔ یہی جنگیں لڑواتی ہے' قتل و غارت کرواتی ہے...... عجیب ملکوتی جذبہ ہے۔

مجھے دنیا بھر کے شاعروں اور ادیبوں پر ٹوٹ کر پیار آتا' جن کی میں ہمیشہ ہنسی اڑاتی تھی۔ اب ان کا ہر شعر مجھے اپنے دل کی ترجمانی کرتا محسوس ہوتا۔ ہر کہانی کی ہیروئن میں بن

جاتی۔ جن فلموں کا میں مذاق اڑایا کرتی تھی' ان فلموں کو دیکھ کر میں اپنی قسمت کی فال نکالا کرتی۔ سارے گیت میرے دل کے ترجمان تھے۔ رات گئے تک موسیقی سنا کرتی۔ کبھی موسیقی کی آواز میں فون کی آواز دب جاتی۔ کبھی امی پاس کھڑی چیخ چیخ کر مجھے متوجہ کرتیں!

میں انہیں کیا بتاتی کہ آج کل میں جس پھول کو دیکھوں' کِھل اٹھتا ہے۔ جس ستارے پر نظر ٹکاؤں آنکھوں میں اتر آتا ہے۔

ایک روز میں نے اس کے گھر کے آگے سے گزرتے ہوئے دیکھا' وہاں دو لڑکے کھیل رہے تھے۔ ایک بارہ سال کا ہوگا اور دوسرا نو سال کا۔

ایسے لگا جیسے میرے سینے کے اندر کوئی بم پھٹا ہے۔ آس پاس کی ہر شے گویا ریزہ ریزہ ہوگئی۔ نصیبوں جلی تو نے از خود یہ کیسے سوچ لیا کہ وہ غیر شادی شدہ ہوگا......؟!

اس کو بتانا چاہیے تھا......!

اچھا! تجھے یہ کیسے یقین ہوگیا کہ وہ بھی تیرے عشق میں مبتلا ہے......؟

خداوندا! سال کے ۳۶۵ دنوں کی نگاہوں سے جڑی رفاقت میں مَیں اتنا سرپٹ کیوں بھاگی کہ ٹھوکر کھالی۔

اس رات اذیت کے مارے مَیں سو نہ سکی۔ بار بار اپنے آپ کو سرزنش کرتی اور کہتی: وہ تیرا کون ہے؟ وہ تیرا کیا لگتا ہے؟ اور تو دن رات کے ہر لمحے میں اسی کے بارے میں کیوں سوچے جاتی ہے......؟ اس سوچ کا انجام تجھے معلوم ہے......؟ تو اسے اپنی سانسوں سے بھی قریب رکھے ہوئے ہے۔ اپنے آپ کو سنبھال!

پھر میں دل ہی دل میں عہد کرتی کہ اب اس کے بارے میں نہیں سوچوں گی۔ اس کا خیال تک ذہن میں نہ لاؤں گی۔ اس راستے سے بھی نہیں گزروں گی۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد مجھے محسوس ہوتا کہ وہ تو سائے کی طرح میرے ساتھ ہے۔ میں مسلسل اس کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ میرے دل کی دھڑکنوں میں اس کی شبیہ دھڑک رہی ہے...... میری سانسوں میں سے اسی کی خوشبو آ رہی ہے۔ میں گھبرا کر کہتی:

کیا یہ محبت ہے؟ کیا محبت ایسی ہوتی ہے؟ انسان کو بے بس اور لاچار کر دیتی ہے۔ کہیں یہ یک طرفہ آگ تو نہیں...... ؟ اس کا تو گھر بار ہے اور یہ بچے؟ آخر میں نے پہلے کیوں نہ سوچا! کئی راتیں انگاروں پر لوٹتے گزریں۔ میں کئی دن تک پارک میں نہ گئی۔ افوہ! تب مجھے پتا چلا کہ میں تو آگ کی ڈگر پر روانہ ہو چکی ہوں۔ دل کہتا چل، وہیں پہ چل...... کسی پل چین نہ تھا۔

میں پھر وہاں پہنچ گئی۔ مگر دل ہی دل میں گویا اس سے خفا بھی رہی۔ وہ سامنے گیٹ پر ہی جیسے میرا منتظر تھا۔ میں اسے دیکھے بنا سامنے سے گزر گئی۔ وہ دوڑتا ہوا میرے پیچھے آیا اور قریب آ کر بولا:

''آج کوئی ناراضگی ہے؟ چہرے پہ اتنا غصہ؟''

''دھڑ دھڑ دھڑ......'' اس کو قریب پا کے میرا دل پسلیوں سے باہر نکلنے لگا۔ نکل جا کم بخت اور اس کے قدموں تلے لوٹ پوٹ ہو کے کچلا جا۔

میری پلکوں کی منڈیریں بھیگ گئیں۔ میں بے بس ہو گئی تھی۔ میرا دل ضد کر رہا تھا، میں اس کی طرف دیکھوں...... اس کی آنکھوں میں اپنا پیار دیکھوں...... اس کے ہونٹوں پر اپنی طلب کی مسکراہٹ دیکھوں...... اور پھر دیکھوں وہ صورت جو میرے کلیجے میں پھانس کی طرح اٹکی ہے۔ اپنے آپ کو باز رکھنا کتنا مشکل لگ رہا تھا۔

''بہت ناراضگی ہے آج! وجہ تو بتاؤ؟''

میں نے آنسوؤں سے بھری آنکھیں اٹھائیں۔

''منانے کا موقع ہی دو۔!''

میں ہار گئی۔ ''اس دن آپ کے گھر میں دو بچے کھیل رہے تھے۔'' میں نے بمشکل گلے میں سے آواز نکالی۔

''میرے بیٹے ہیں۔'' وہ لہجے میں باپ کا پیار سمو کر بولا ''آج کل ہوسٹل سے آئے ہوئے ہیں۔ پہلے گاؤں میرے امی ابا جی کے پاس چلے جاتے تھے۔ اس بار یہاں آ گئے ہیں......''

میں نے یہ صدمہ چھپانے کے لیے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ (تم...... تم نے میرے

علاوہ کسی اور سے شادی کی جرأت کیسے کی..... کیسے کی؟) میں دانت پیستی رہی اور وہ آہستہ آہستہ کہتا رہا:

"ہمارے ہاں رواج ہے۔ والدین بچپن میں ہی شادی کر دیتے ہیں۔ اپنی مرضی کے مطابق..... ابھی میں انیس برس کا تھا' میرے والدین نے میری شادی' پھوپھی زاد سے کر دی۔ گاؤں کی ہے۔ ان پڑھ ہے' پردہ کرتی ہے۔ میں نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ ملک سے باہر بھی گیا۔ شوقیہ سرکاری نوکری کرتا ہوں۔ ہم لوگ زمیندار ہیں۔ چند سال پہلے میں نے یہاں گھر بنایا ہے۔ جب سے میں اس گھر میں آیا ہوں' میری بیوی بیمار رہتی ہے۔ اس لیے دونوں بیٹوں کو ہوسٹل میں داخل کرا دیا ہے۔"

وہ دھیرے دھیرے یوں بولتا رہا جیسے اسے میرے چہرے کی شکن در شکن الجھن سے کوئی سروکار ہی نہیں..... بتاتا رہا اپنے شب و روز..... اپنے مشاغل جیسے کہ میں مری جا رہی ہوں..... اونہہ!

میں کوئی جواب دیے بغیر آ گئی۔ میرا خیال تھا' میں اب وہاں کبھی نہیں جاؤں گی' اس کی صورت تک نہیں دیکھوں گی۔ رات کو تکیے میں منہ چھپا کر میں کتنی دیر تک روتی بھی رہی تھی۔ پتا نہیں کیسے میں دوسرے دن وہاں پہنچ گئی' جہاں وہ کھڑا تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا۔ میرے دل کے اندر ڈھول بجا اور جیسے چاند چھلانگ لگا کر زمین پر آ گیا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جو ہماری محبت کے لیے چنے گئے تھے وہ کسی اور کے ہو چکے تھے؟ یا اللہ..... محبت کتنا ذلیل کرتی ہے!

اس کے ہونٹ کسی آگ میں جل رہے تھے' جیسے کہہ رہے ہوں: میں نے جذبوں کی کمند ڈالی ہے۔ اجتناب کی فصلیں خواہ کتنی اونچی کر لو۔

وہ جیت گیا اس کے خیال کو دل سے نکالنا میرے لیے ممکن نہ رہا۔

اب یوں ہونے لگا کہ جب اس کی بیوی گاؤں چلی جاتی' وہ مجھے اپنے پھولوں بھرے لان میں بلا لیتا۔ اپنے ہاتھ سے کافی بنا کر مجھے پلاتا۔ اپنے یورپ کے سفر کے قصے سناتا۔ اپنے

پھولوں کے شوق کے بارے میں تفصیل سے بتاتا کہ اس لان میں ساری کاریگری اس کے ہاتھوں کی ہے۔ کبھی کبھی وہ مجھے اپنی کوئی پسندیدہ کیسٹ دیتا۔ جسے میں ساری رات سنا کرتی اور سوچا کرتی اگر موسیقی نہ ہوتی تو بنی نوع انسان کے انمول جذبے اَن کہے رہ جاتے۔

محبت میں وقت کو پر لگ جاتے ہیں۔

ہمارے اوپر سے صدیاں اُڑ اُڑ کر گزرنے لگیں۔ رات کو اتنی گہری نیند آتی جیسے کسی نے نشہ پلا دیا ہو۔ صبح آنکھ خوابوں کا خمار لے کر کھلتی۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ محبوب کا تصور بھی شراب خانے کا کام کرتا ہے۔ میں سوچا کرتی، آخر ماہرینِ نفسیات بے خوابی کے مریضوں کو یہ مشورہ کیوں نہیں دیتے کہ وہ کسی کی محبت میں مبتلا ہو جائیں! انہیں نیند کی گولی کھانے کی ضرورت نہیں رہے گی!

ایک دن جب میں اس کے لان میں بیٹھی تھی، اس کے ہاتھ سے کافی کی پیالی لے کر اس کے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ کس قدر توانا تھے اس کے ہاتھ...... صحت مند، سرخ اور مضبوط! بعض مردوں کی مردانگی ان کے ہاتھوں سے چھلکنے لگتی ہے۔ سلیقے سے کٹے ہوئے ناخن، بھری بھری انگلیاں جو خود اعتمادی کے ورق لگتی تھیں...... پتا نہیں کیوں اس کے ہاتھ دیکھ کر میرے دل میں ہلچل ہونے لگتی۔ وہ میرے دل میں اٹھتے طوفان سے بے خبر ملائمت سے پوچھ رہا تھا:

''تم نے ابھی تک اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

''میرے بارے میں کچھ خاص ہو تو بتاؤں!''

''عام ہی...... بتاؤ تو!''

میں نے اسے بتا دیا کہ دو سال پہلے جس کے ساتھ میرا نکاح ہوا تھا وہ ملک سے باہر رہتا ہے۔ میرا اس کا ایک ایسا اختلاف پیدا ہو چکا ہے کہ میں نے اس کے ساتھ رہنا پسند نہیں کیا۔ میرا خیال تھا میری طرح آج اس پر صدموں کا پہاڑ ٹوٹے گا اور وہ اپنی ساکھ برقرار نہ رکھ سکے گا اور پھر ٹوٹ ٹوٹ کر اور بکھر بکھر کر پوچھے لگا:

''کیسے؟ کیوں!''

مگر وہ تو اطمینان کی مسند پر بیٹھا والہانہ پن سے مسکراتا رہا۔ جو لوگ دوسروں کے تن من میں آگ لگا دیتے ہیں وہ خود کیوں اتنے پرسکون نظر آتے ہیں؟!

''دیکھو......'' وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر اپنے قاتلانہ انداز میں بولا: ''قدرت کے کام کتنے عجیب ہوتے ہیں۔ جنہیں ہماری زندگی تلاش کرتی ہے وہ کس موڑ پر آ کر ملتے ہیں۔ تم سے ملنے کے بعد میں اکثر سوچا کرتا ہوں' اگر ایک دن تم مجھے نظر نہ آ جاتیں تو مجھے ساری عمر پتا نہ چلتا کہ میرے جنم کا مقصد کیا تھا۔''

میرے دل کا خون میرے چہرے پر آ گیا۔

وہ بولا ''اپنی تمنا کو مجسم دیکھ لینا بھی بڑی خوش نصیبی کی بات ہے۔ پتا نہیں تم کیا سوچتی ہو گی مگر میں تو آج کل صرف تمہیں سوچا کرتا ہوں۔ احسان نہیں' ذہن کی عادت بن گئی ہے۔ کہاں آ کے ملی ہو' کب آ کے ملی ہو......!''

میں اس وقت بھول گئی کہ وہ شادی شدہ ہے' اس کے دو بچے ہیں اور یہاں اس کی بیوی رہتی ہے' جس گھر میں مَیں بیٹھی ہوئی ہوں۔

گھر آ کر میں نے اپنے آپ سے پوچھا:

''تو کیا چاہتی......؟''

''بس اسی کو چاہتی ہوں ہر قیمت پر......''

''کیا سوتن بننا پسند کرے گی؟''

''ہاں: ہاں! اگر کوئی اور چارہ نہ ہوا تو۔''

خاموش محبتیں ہمیشہ قہر بن کو ٹوٹا کرتی ہیں۔

اگلے دن میں نے اپنی امی سے کہا:

''امی میں جواد سے چھٹکارا حاصل کر کے کسی اور سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔''

امی نے میرا چہرہ غور سے دیکھا...... میرا چہرہ تو کئی دنوں سے دیکھ رہی تھیں اور شاید میرا چہرہ انہیں بہت کچھ بتا بھی چکا تھا۔

''سوچ لو''انہوں نے مری ہوئی آواز سے کہا۔

''سوچ لیا ہے''میں نے تلخی سے کہا''اب اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کا حق مجھے دیں۔''

مزید ۳۶۵ دن گزر گئے۔ گویا ہماری محبت کی کہانی ۷۳۰ دن کی ہوگئی تھی۔ جیسے ہوا سے کتاب کے ورق الٹتے ہیں'اسی طرح وقت اڑا چلا جارہا تھا۔ ۷۳۰ دنوں میں عشق'جنوں کے راستے پر چل پڑا تھا۔ اس کا بھی' میرا بھی! جنوں کسی کا خیر خواہ نہیں ہوتا' اسی لیے تو عقل کا اس سے بیر ہوتا ہے۔

پھر ایک دن میں اس کے پھولوں بھرے لان میں بیٹھی تھی......وہ بولا:

''یوں کب تک؟''

میں نے نظر اٹھائی'اس کی نظریں بھٹکتی جارہی تھیں۔

''کیا تم کوئی خاص امتحان لینا چاہتی ہو؟''

''آپ ہی بتائیں''....میں نے جلتے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا''آپ کی شادی ہوچکی ہے' میرا نکاح ہوچکا ہے۔ جب تک پہلے بندھن نہیں ٹوٹیں گے'نئے خواب کیسے پورے ہوں گے؟''

اس دن طے ہوا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے گا۔ بچے اپنے والدین کی تحویل میں دے دے گا اور میں نکاح فسخ ہونے کا دعویٰ کردوں گی۔

اگلے دن میں نے اپنے وکیل کو بلایا اور اسے کہا کہ میری طرف سے کاغذات تیار کر کے وہ جواد کو نوٹس بھیج دے۔

ان دنوں میں اکثر پاگل پن والی حرکتیں کیا کرتی۔ مثلاً یہ کہ ہر وقت دعائیں مانگا کرتی۔ اللہ کرے'اس کی بیوی مر جائے! یہ کانٹا خود ہی نکل جائے۔ کوئی ایسا حادثہ ہوجائے کہ اس کی مجھ سے شادی ہوجائے۔

ایک ہفتہ تک وہ مجھے نظر نہ آیا۔ اس سے پہلے وہ جب بھی شہر سے باہر جاتا تو مجھ بتا کر جاتا تھا۔ اس مرتبہ اچانک غائب ہوا تو میں ویران سی ہوگئی۔ اپنی فضول فضول دعاؤں پر رنج سا ہونے لگا۔ جدائی میں محبت ہمیشہ وارفتہ ہوجاتی ہے۔ پل بھر مجھے چین نہ آتا۔ میرے لیے

ساری دنیا خالی ہوگئی۔ ہر ایک سے الجھتی لڑتی پھرتی۔ بھلا ایک آدمی زندگی کے اوپر اس قدر حاوی کیوں ہو جاتا ہے کہ اس کے بنا ہر شے بے کار نظر آنے لگتی ہے!

آٹھ دن' جیسے مجھ پر آٹھ قیامتیں گزر گئیں......

جب وہ نظر آیا تو میری نظر میں قہر تھا' دل میں غصہ تھا۔

وہ مجھے اپنے لان میں لے گیا' کافی بنا کر لایا اور میرا پھولا پھولا منہ دیکھ کر بولا:

''میری بیوی شدید بیمار ہے۔ بیمار تو وہ عرصہ سے تھی مگر یہاں تشخیص ٹھیک نہیں ہو رہی تھی۔ ایک نئے ڈاکٹر سے پورے ٹیسٹ کروائے ہیں تو پتا چلا اسے کینسر ہے۔'' (اس وقت مجھے اللہ پر بہت پیار آیا۔ کتنی جلدی اس نے میری دعا سُن لی تھی!)

''فوری علاج کے لیے اسے انگلینڈ بھیجنا ضروری ہو گیا تھا۔ وہاں میری چھوٹی بہن رہتی ہے۔ اسے اطلاع دی' انتظامات کرنے اور بیوی کو بھیجنے میں اتنے دن لگ گئے۔ تمہیں اطلاع بھی نہ دے سکا......''

''کوئی بات نہیں'' ...... میرا غصہ تو اس کی بیوی کی بیماری کا سنتے ہی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔

''آپ ساتھ نہیں گئے' چلے جاتے!'' ...... مَیں نے بس یونہی اوپرے دل سے کہا (اف محبت انسان کو کتنا خود غرض بنا دیتی ہے)

''میرا چھوٹا بھائی ساتھ گیا ہے' میں نے چھٹی لینی ہے' کچھ اور انتظامات کرنے ہیں۔ آپریشن کے وقت چلا جاؤں گا۔''

میرے دل کو جیسے قرار سا آ گیا۔

ایک دن جب بارش ابھی ابھی ہو کے رُکی تھی اور زمین کے سینے سے سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی' قطروں کے ہار پہنے سارے پھول اور پودے مسکرا رہے تھے' آسمان کا رنگ سنہری ہو رہا تھا' ہم دونوں پارک سے نکل کر اُس کے گھر میں آ گئے۔ اب تو روز طویل ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ چونکہ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی' وہ مجھے اندر اپنے بیڈ رُوم میں لے گیا۔

اس کا بیڈروم میرے ہر خواب سے حسین تھا۔ سلیقہ، ذوقِ لطیف، فرنیچر کا انتخاب، روشنیوں کا قرینہ، اندر کیا نہیں تھا۔ اس نے ہماری پسندیدہ کیسٹ لگا دی۔ میں ابھی تک کھڑی ایک ایک چیز کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ وہ کافی بنانے لگا۔ میرے دل میں جلن ہونے لگی، یہاں وہ اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہوگا۔

اس نے کافی بنا کر میرے ہاتھ میں تھمائی اور کہنے لگا:

''یہ صرف میرا بیڈروم ہے۔ میری بیوی کا کمرہ علیحدہ ہے۔ میں اس کمرے میں سارا وقت اپنی مرضی سے گزارتا ہوں۔''

''تنہائی محسوس نہیں کرتے؟'' اندر سے میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔

''اب نہیں!'' اس نے آنکھوں میں مستی چھپا کر کہا۔

میں صوفے پر بیٹھنے لگی تو اس نے ہاتھ سے مجھے روک دیا، بولا: ''یہاں بیٹھو، میرے بیڈ پر...... !''

''عرصہ سے تمنا تھی، تمہیں یہاں بیٹھے ہوئے دیکھوں۔''

میں مسکرا کر بیٹھ گئی۔ مجھے ایسے لگا جیسے میں اس کے اختیار میں ہوں اور وہ مجھے مسمرائز کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ وہ اپنے اسی جان لیوا لہجے میں دھیرے دھیرے بولنے لگا:

''میں اکثر سوچتا ہوں، محبت عجیب چیز ہے۔ میں نے کبھی سوچا نہیں تھا، جب میرے دو بچے ہو جائیں گے، میں زندگی کے آگے ہتھیار ڈال دوں گا، تب مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو جائے گی اور محبت بھی ایسی ...... '' وہ تھوڑا سا رکا '' قصے کہانیوں والی ...... کہ اُسے پائے بنا جیا نہ جائے ...... اب ہمہ وقت سوچتا ہوں، اس کو کیسے حاصل کروں؟ کیسے پاؤں اُسے، کیسے اپناؤں اُسے؟''

اس نے پہلی مرتبہ میرا ہاتھ تھام لیا۔ اف! میں تو صدیوں سے اس خواہش میں جل رہی تھی۔ میرے اندر بھڑ بھڑ شعلے جاگے۔ میں گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے محسوس کیا، میں جذبوں کی یلغار سے لرز رہی تھی بلکہ کانپ رہی تھی۔ وہ جب میرے قریب کھڑا ہوا تو اس کے دل کے زور زور سے دھڑکنے کی صدائیں اپنے کانوں سے سن رہی تھی، شاید میرا دل بھی اتنے ہی زور

سے دھڑک رہا تھا۔! اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میرے ہونٹ لرز رہے تھے۔ ہم دونوں جذبات کے پل صراط پر پہنچ گئے تھے مگر مجھے بخوبی احساس تھا کہ یہ پل صراط ہے' سانس بھی زور سے لی تو میں گر جاؤں گی' اس لیے میں نے پل صراط پر اپنا پاؤں احتیاط سے رکھا!

مجھے اس کی صورت سے معلوم ہو رہا تھا کہ اس کا حال بھی میرے جیسا ہے۔ بس دل یوں چاہ رہا تھا' کوئی جادوئی تخت آئے اور ہم دونوں کو اسی حالت میں اڑا کر دنیا سے دور کسی الف لیلوی جزیرے میں چھوڑ دے۔ بس وہاں کوئی نہ ہو ہمارے سوا!

''تم نے میرا بہت امتحان لیا ہے اور کتنا امتحان لوگی؟''

میں اس کی سانسوں کی خوشبو محسوس کر رہی تھی۔ میں نے خوف زدہ نظروں کو سوال بنایا'

وہ بولا:

''میں سمجھ گیا ہوں' تم ایک روایتی لڑکی ہو۔ تم مجھ سے باقاعدہ شادی کرنا چاہتی ہو۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں' اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہوں۔ مگر اب جو اس کی بیماری آڑے آئی ہے...... ٹھیک بھی ہو سکتی ہے' مر بھی سکتی ہے۔ اگر وہ ٹھیک ہو کر آ گئی تو بھی میں اسے طلاق نہ دے سکوں گا۔ سارا خاندان تھو تھو کرے گا کہ میں نے ایک بیمار عورت کو ٹھکرا دیا اور اس کی زندگی کتنی ہے' یہ تو ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا' تم اس وقت مجھے سہارا دو!''

''کوئی بات نہیں......'' میں نے لرز۔تے ہوئے کہا ''آپ انتظار کریں!''

''انتظار......؟'' اس نے زور سے کہا۔ ''کتنے سال؟ میں دو سال سے ایک آگ میں جل رہا ہوں اور مجھے معلوم ہے تم بھی جل رہی ہو' ہم ان بکھیڑوں میں کیوں پڑیں...... تم نکاح فسخ کرواؤ' میں طلاق دوں...... بڑے واہیات مرحلے ہیں۔ کیوں نہ تیسری راہ تلاش کی جائے؟''

''تیسری راہ؟'' میں نے جیسے خواب میں پوچھا۔

''جس طرح کسی موڑ پر اچانک محبت زندگی میں داخل ہو جاتی ہے' یہ دیکھے بنا کہ دوبارہ زندگی شروع کرنے کی مہلت ہے یا نہیں...... اسی طرح محبت ایک تیسرا راستہ تلاش کرتی ہے۔''

''جی...... جی!'' میں اپنا ہاتھ چھڑا کر ایک طرف سمٹ گئی۔

''سنو عنبرین! شادی دو انسانوں کے درمیان ایک سمجھوتا ہے' ایک معاہدہ ہے۔'' وہ میری طرف بڑھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں وہ سرخی اتر آئی جو خالص مرد ہوتی ہے۔ میں نے پہلی بار شعلوں کی لپک میں اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ دھیرے دھیرے میری طرف آیا۔ دو سالہ محبت عقل سے ماورا ہو گئی۔ یہی کچھ تو میرے خوابوں میں رہتا تھا۔ اس نے سرگوشی میں اپنی بات جاری رکھی:

''اسی طرح محبت دو دلوں کے درمیان ایک معاہدہ ہے' ایک سمجھوتا ہے......'' (میرے کنوارے ارمان مجھے تپتے ہوئے تنور کے کنارے لے گئے...... اس کا ہو جانا' اس کے بازوؤں میں سما جانا' محبت جو کچھ سوچتی ہے' بیان میں نہیں آ سکتا) وہ بولا: ''فرق صرف اتنا ہے کہ محبت کے معاہدے کے لیے کسی قاضی' کسی گواہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک دل قاضی بن جاتا ہے اور دوسرا گواہ۔ سنو جانم! انگلینڈ سے آنے کے بعد میں اپنی بیوی کو گاؤں بھیج دوں گا۔ وہ مستقل وہیں رہے گی اور تم یہاں میرے اس کمرے میں میرے دل میں......!''

وہ قریب ہوا...... میں دور ہٹ گئی۔

''پھر جب حالات ہمارے حق میں ہوئے شادی بھی کر لیں گے...... کیوں دوری کی سزا کاٹیں؟ اب زمانہ بدل گیا ہے...... دنیا بھر میں ایسے بندوبست ہوتے ہیں...... تم اتنی تعلیم یافتہ ہو کے اتنی روایتی نہ بنو......!''

روایتی؟ میں نے تو روایات سے اور اپنی عادات سے بغاوت کی تھی۔ اس ستمگر کے لیے' جو میرے دل کی آخری تمنا بنا میرے سامنے کھڑا تھا۔ میری ایک ہاں جسے پاگل پن کی حدود میں داخل کرنے کو کافی تھی اور جسے میں نے اپنے عشق میں دیوانہ بن جانے کی تمنا کی تھی......

وہ ذرا آگے بڑھا' میں ذرا پیچھے ہٹی...... اف توبہ! محبت کی ڈیمانڈ کس قدر خطرناک ہوتی ہے! کسی مذہب' کسی قدغن کو خاطر میں نہیں لاتی۔ موم آگ کے نزدیک آتی جا رہی تھی......

عین اسی وقت کسی کونے کھدرے میں بیٹھی ہوئی روایتی عورت نے نکل کر میرے منہ پر زناٹے دار تھپڑ رسید کر دیا۔ سجا سجایا کمرہ گول گول گھومنے لگا۔ ہر عورت کے اندر ایک روایتی

عورت ہوتی ہے ایک باغی عورت ہوتی ہے عام طور پر روایتی عورت جیت جاتی ہے۔

مجھے نہیں معلوم مَیں کیسے اس کمرے سے باہر آئی' جس کمرے میں میری جنت تھی۔ پھر اُلٹے پاؤں بھاگی۔ ٹریک پر بھاگتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا' ورلڈ ٹریڈ سنٹر جیسی بلند و بالا عمارتیں دھڑا دھڑ میرے اُوپر گر رہی ہیں۔ میں باقاعدہ ان کے گرنے کے دھماکے سن رہی تھی اور محسوس کر رہی تھی کہ جیسے سارا ملبا میرے اُوپر گر رہا ہے۔ پتا نہیں گھر کیسے پہنچی۔ بستر پر اوندھے منہ گری اَور بے ہوش ہو گئی۔

ہوش آیا تو تیز بخار تھا۔ امی سرہانے بیٹھی تھیں۔ ڈاکٹر انجکشن لگا رہا تھا۔ ہذیان اور خفقان میں بخار ایسا بگڑا کہ ٹائیفائیڈ بن گیا۔ یوں پورا مہینہ قدرت نے مجھے ماہِ حزن منانے کو دے دیا۔

ذرا ٹھیک ہوئی تو امی نے بتایا کہ ایک آدمی کا دو تین بار فون آ چکا ہے۔ مجھے پھر لرزہ ہونے لگا۔ تپ چڑھنے لگا۔ اسی رات اس کا فون آ گیا:

''تمہاری امی نے بتایا' تمہیں بخار ہے' اب کیسی ہو؟''

''ٹھیک ہو جاؤں گی۔'' میرا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

''میں انگلینڈ جا رہا ہوں' شاید ایک ماہ وہاں رہنا پڑے' تمہاری بیماری کی وجہ سے تمہیں ملے بنا جانا پڑ رہا ہے۔''

میں نے فون رکھ دیا۔

مائیں بڑی سیانی ہوتی ہیں۔ امی میرے چہرے کو مسلسل دیکھا کرتیں' اس وقت چاند پھوٹتے بھی دیکھا کرتی تھیں' اب گرہن میں قید بھی دیکھ رہی تھیں۔

ایک دن کہنے لگیں:

''بیٹا اپنے آپ کو سنبھالو۔ احساس میں اتنی شدت اچھی نہیں ہوتی۔ یاد ہے جواد سے لڑائی کے بعد بھی تم اتنی ہی بیمار ہو گئی تھیں۔''

☆☆☆

ایک مہینے کی بیماری نے مجھ سے وہ سب کچھ چھین لیا جس نے مجھے ساتویں آسمان پر

چڑھا رکھا تھا۔ نہ آنکھوں میں وہ ستارے رہے، نہ گالوں پہ گلاب رہے، نہ ہونٹوں میں رس رہا، نہ زلفوں میں کس بل رہے، اُف کس قدر فانی چیز ہے یہ حسن...... ایک صدمہ...... ایک بیماری، چہرہ بدل کے رکھ دیتی ہے!

ایک بار آسمان سے گر کر کوئی زمین سے اُٹھ نہیں سکتا۔ گہرے سمندروں میں ڈوب جانے والوں کی لاش بھی نہیں ملتی۔ اگر پرندہ بہت بلندی سے گرے تو اُس کے پر ٹوٹ جاتے ہیں۔ میرا وجدان بڑی رفعتوں سے نیچے گرا تھا۔ یہ ہوا کیسے کہ اس نے مجھے درجہ دوئم کی لڑکی سمجھ لیا۔ میں اب جب بھی اس کے بارے میں سوچتی، دھڑ دھڑ کر کے عمارتیں مجھ پر گرنے لگتیں، دروازے کھڑکیاں ٹوٹنے لگتے، خاک اُڑنے لگتی۔ میرے آس پاس ملبے کا ڈھیر لگ جاتا......

میں بستر پر لیٹی درد میں ڈوبے گیت سنتی رہتی اور روتی رہتی اور پہلے سے زیادہ حیران ہوتی کہ غم میں ڈوبا ہر گیت میرے جذبات کی ترجمانی کرنے لگتا۔ کیا واقعی ان شاعروں کے دل کو چوٹ لگتی ہے یا ان پر انسانی جذبوں کے الہام اُترتے ہیں۔ کتنی خوبصورتی سے درد واندوہ کی کیفیت کو بیان کر جاتے ہیں۔

بہت دِنوں بعد موسم کچھ بدلا تھا۔ میں نے کپڑے بدل کر اپنی آنکھوں کے سیاہ حلقوں کو آئینے میں دیکھا اور باہر صحن میں جا کر لیٹ گئی۔ اسی لمحے ایک مرد سوٹ کیس اُٹھائے گھر میں داخل ہوا۔

ہاں! وہ جواد تھا۔ امی اسے دیکھ کر حیران اور پھر پریشان ہو گئیں۔

''کیا کرتا؟'' وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ''ان کے نوٹس نے یوں اچانک آنے پر مجبور کر دیا۔''

وہ امی کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے سلیپر پہنے اور اُٹھ کر اندر آ گئی۔ ایک بے کلی میرے ساتھ ہی آ گئی۔ وہ کافی دیر بیٹھا امی سے باتیں کرتا رہا۔ امی کو وہ پسند بھی بہت تھا۔ امی اس کی آؤ بھگت میں لگ گئیں۔

پھر وہ میرے کمرے میں آیا، بولا:

''تم بہت کمزور ہوگئی ہو امی نے بتایا کہ تمہیں ٹائیفائڈ ہو گیا تھا'' ......رُکا...... ہنسا......
اور پھر بولا: ''اتنا غصہ دل میں نہ رکھا کرو کہ بخار سے نکالنا پڑے!''

میں آنکھوں پہ بازو رکھے لیٹی رہی۔

اس نے میز پر سوٹ کیس رکھ دیا اور اس کے ساتھ چابی بھی رکھ دی۔

''میں کچھ چیزیں تمہارے لیے لایا تھا۔ ائیر پورٹ سے سیدھا ادھر آ گیا ہوں۔ اب امی ابا کے پاس جاؤں گا۔ ان کو بھی اطلاع نہیں دے سکا۔ دو چار دن بعد پھر چکر لگاؤں گا۔ اب تم ٹھیک ہو جاؤ!''

اس کے جانے کے بعد امی اندر آئیں' اُنہوں نے چابی پکڑ کے سوٹ کیس کھول دیا۔ اس میں وہ ساری چیزیں تھیں جو ایک شوہر اپنی بیوی کے لیے لا سکتا ہے۔ کپڑے' زیور' جوتے' پرس' میک اَپ کا سامان' پرفیوم' ڈیکوریشن پیس...... میں بے دلی سے دیکھتی رہی۔ امی ایک ایک چیز کی تعریف کرتی رہیں۔ پھر میرے پاس بیٹھ گئیں۔ ماتھے پر سے میرے بال ہٹائے اور ماؤں والے سلیقے سے گویا ہوئیں:

''جواد کہہ رہا تھا' اگر عنبرین کی یہی شرط ہے کہ میں ملازمت چھوڑ کر پاکستان آ جاؤں تو میں آنے کو تیار ہوں۔''

تین سال پہلے جب میں نے ایم اے کر لیا تھا' میرا نکاح ہو گیا۔ جواد سویڈن میں رہتا تھا۔ ایک غیر ملکی ائیر لائن میں ملازم تھا۔ تنخواہ بہت اچھی تھی۔ اس نے اخبار میں شادی کے لیے اشتہار دیا تھا۔ میرے ماموں نے اس کا اَتا پتا لگایا اور رشتہ اوکے کر دیا۔ جواد کو بلایا گیا اور میرا نکاح ہو گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اشتہاری شادیوں میں گھپلا ضرور ہو جاتا ہے۔ چھ ماہ ہی گزرے تھے' ان کے رشتہ داروں نے گمنام خط لکھنے شروع کر دیے کہ اس نے سویڈن میں شادی کی تھی۔ ایک بچی تھی' اس عورت کو طلاق دے چکا ہے۔ جب میں نے گھر میں اس فراڈ کا بھانڈا پھوڑا تو امی نے اور ماموں جان نے مجھے بہت آہستگی سے سمجھایا کہ اس نے ہم سے کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔ ہم نے مصلحتاً تمہیں نہیں بتایا تھا۔ خیال تھا رخصتی کے وقت بتا دیں گے۔

''کیوں...... کیوں آخر......؟''

میں ہتھے سے اُکھڑ گئی۔ گھر والے سمجھا بجھا کر تھک گئے۔ جواد نے فون پر بات کرنے کی کوشش کی۔ خطوط میں معافیاں مانگیں مگر میری طرف سے ایک انکار......

''آپ نے اپنے ملک میں بھی کوئی آدمی نہیں ڈھونڈا اور دوسرے ملک سے ایک ایسا آدمی میرے مقدر میں لکھ دیا جو شادی رچا چکا ہے۔ محبت کا زمانہ گزار چکا ہے۔''

میں نے ضد میں آ کے نوکری کر لی' پھر کیا ہوا' میرے دل میں ایک ایسا آدمی آ بیٹھا جس کی پہلی بیوی بھی تھی اور دو بچے بھی۔ میں اس کی بیوی کے ہوتے ہوئے اس سے شادی کرنے پر رضامند تھی' اس کے دونوں بچوں کی ماں بننے پر تیار تھی!!!

یہ کیسے ہو گیا......؟ واہ محبت کا کیا کمال ہے؟ ہاں! محبت ہی کا اعجاز ہے۔ صورت بدل دیتی ہے' اصول بدل دیتی ہے' جہان بدل دیتی ہے' حالات بدل دیتی ہے' زاویۂ نگاہ بدل دیتی ہے۔ اور تو اور ساری زندگی کا فلسفہ بدل دیتی ہے!!

میں نے جواد سے کہا کہ وہ ایک ہفتے کے اندر اندر مجھے اپنے ساتھ لے جائے۔ حیران تو امی بھی تھیں اور سب گھر والے بھی...... کیونکہ میں نے شرط ہی ایسی رکھ دی تھی۔ میں نے کہا تھا' جواد جس رات کی سیٹیں کنفرم کروائے گا' اس روز شام کو سادگی سے میری رخصتی ہو جائے گی۔ میں باقاعدہ دلہن نہیں بنوں گی۔ گھر سے رخصت ہو کر جہاز میں آ بیٹھوں گی۔ میری ضدی طبیعت سے سب ہی واقف تھے' انہوں نے ایسا ہی بندوبست کر دیا۔ اصل میں مَیں ایک ماہ ختم ہونے سے پہلے یہ شہر' یہ ملک چھوڑ جانا چاہتی تھی۔

ایئرپورٹ پر سب مجھے چھوڑنے آئے۔ میرے کپڑے سفید تھے۔ بس میری کلائیوں میں سونے کی نئی چوڑیاں تھیں جو امی نے اپنے ہاتھ سے مجھے پہنائی تھیں۔ جب میں جہاز کی طرف جانے لگی تو امی نے مجھے سینے سے لپٹا لیا اور مجھے بھینچ بھینچ کر روئیں' میں پتھر کی طرح چپ رہی' میری آنکھ کے آنسو کچھ عرصہ پہلے ختم ہو گئے تھے۔

اور اب تو دل سے میں اپنا بدلہ لے رہی تھی۔ مجھے تو آنکھ کا کفارہ ادا کرنا تھا۔

''بیٹی خوش رہنے کی کوشش کرنا...... اللہ تمہیں خوش رکھے۔'' امی نے ماتھا چوم کر دُعا دی۔
میں نے مڑ کر نہیں دیکھا بلکہ اپنے آپ کو مڑ کر دیکھنے کی مہلت ہی نہیں دی اور جا کے جہاز میں بیٹھ گئی۔

جب جہاز نے پرواز کی تو جواد نے میرا چہرہ غور سے دیکھ کر کہا: ''تم شاید تھک گئی ہو' میں کسی خالی سیٹ پر جا بیٹھتا ہوں' تم یہاں سو جاؤ...... آرام کرو۔''

''نہیں!'' میں نے پرس کھولا ''اصل میں مجھے اپنی دوا بھی کھانی ہے' پہلے کھانا کھاؤں گی پھر دوا کھا کے سو جاؤں گی۔'' یہ دوا وہ نیند کی گولی تھی جس نے ایک ماہ سے مجھے سکون میں رکھا ہوا تھا۔

سویڈن پہنچ گئی۔ جواد کا ایک چھوٹا سا بکھرا ہوا گھر تھا۔ میں چاروں طرف دیکھ رہی تھی' وہ میرے لیے چائے بنا کر لایا اور بڑے مہربان لہجے میں بولا:

''بینا! میں بُرا آدمی نہیں ہوں' اتنی محبت سے تمہیں بیاہ کر لایا ہوں' تمہیں دنیا کا ہر آرام دینے کی کوشش کروں گا۔''

میں نے کہا:

''جواد! میں اپنی رضا سے تمہارے ساتھ آئی ہوں اور وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں ہر طرح خوش رکھنے کی کوشش کروں گی...... مگر تم بھی ایک وعدہ کرو!''

''کیا؟''

''میں بڑی موڈی لڑکی ہوں' اسی لیے مجھے شادی سے خوف آتا تھا۔ مجھ پر عجیب وغریب موڈ گزرتے ہیں۔ کبھی کبھی میرا دل پاتال میں اُتر جاتا ہے۔ میں گم صم ہو جاتی ہوں' اپنے آپ سے بھی بے گانہ ہو جاتی ہوں۔ بس جب مجھ پر ایسا عالم گزرے' تم ان دنوں مجھے کچھ نہ کہنا...... میرے وجود کو چھونا تک نہیں...... مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا کرنا۔ دو چار دن کے بعد میں خود ٹھیک ہو جاتی ہوں۔ باقی رہی گھرداری' میں اس سے کبھی غافل نہیں رہوں گی۔ اپنا ہر فرض ادا کرتی رہوں گی۔''

جواد نے اپنا وعدہ نبھایا اور میں نے اپنا......

میں نے زندگی کی ساری خوب صورتیاں اس کے گھر میں بھر دیں۔ وہ بڑا ملنسار آدمی تھا۔ اس کے ملکی و غیر ملکی سینکڑوں دوست تھے۔ ہمارے گھر میں دعوتوں پارٹیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کے سارے دوست ہمیں ایک ''آئیڈیل کپل'' کہتے تھے۔ میں کام کرتے تھکتی نہ تھی۔ خود کو ہمیشہ مصروف رکھتی۔ ہر ویک اینڈ پر ہمارے ہاں میلہ سا لگ جاتا۔ میری میزبانی اور خانہ داری کے چرچے تھے۔ میں اپنے ذہن کی یورش سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو جسمانی طور پر مصروف رکھتی۔ زندگی کا یہ رُخ میرے لیے بالکل نیا اور حیرت انگیز تھا۔

سال بعد' میرا بیٹا پیدا ہو گیا۔ اس کو بازوؤں میں لیتے ہی میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں سے بے نیاز ہو گئی۔ میں اکثر سوچا کرتی کہ بچہ قدرت کا انمول انعام ہی نہیں' ایک نادر سمجھوتا بھی ہے۔ اپنے آپ سے' اپنے حالات سے' عشق کی ساری رسمیں اس پر سے قربان کی جا سکتی ہیں۔ میں نے اپنے بیٹے کا نام نادر رکھ دیا۔ زندگی اربوں کھربوں لوگوں کی طرز پر گزرنے لگی۔

گاہے گاہے میرے چپ کے قفل کو توڑنے کے لیے جواد کہہ دیتا:

''یار کبھی تو بیویوں کی طرح مجھ سے جھگڑا کیا کرو۔ ہر بات پہ اچھا کہہ دیتی ہو' ہر بھول کو ہنس کر ٹال دیتی ہو۔''

''میں نے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھوں گی۔''

''نہیں جاناں! شوہر چاہتا ہے کہ بیوی لڑ جھگڑ کر اپنا استحقاق منائے۔ کبھی کبھی اس پر شک کرے...... روئے...... چیخے' ازدواجی زندگی کو یہ باتیں منجمد نہیں ہونے دیتیں......''

میں کہتی: ''جب تم مجھ سے اُکتا جاتے ہو تو باہر چلے جایا کرو۔ کچھ اچھا وقت دوسری عورتوں کے ساتھ گزار لیا کرو۔''

''گدھی!'' وہ غصے سے دانت پیستا ...... ''میں ایسا ضرور کرتا اگر تم ایک جھگڑالو اور شکی بیوی ہوتیں۔ اس گھر کو تم نے جنت کا ٹکڑا بنا رکھا ہے۔ میری منہ سے فرمائش نکلتی ہے اُور تم بوتل کے جن کی طرح لے کر حاضر ہو جاتی ہو۔''

•

''شاید تمہیں یہ سکون کاٹنے لگا ہے۔'' میں ہنس کر کہتی۔ وہ قہقہہ لگاتا۔
کبھی چپ مرد کو توڑ دیتی ہے' کبھی مروڑ دیتی ہے۔ اکثر مرد بیویوں کی بک بک سے تنگ آئے ہوتے ہیں۔ بہت سی ازدواجی الجھنیں ہمارے گھر میں تصفیہ کے لیے آنے لگیں۔ سویڈن جیسے ملک میں جہاں حسن اَور فراوانی ہے مگر خودکشی کی شرح ساری دُنیا سے زیادہ ہے' وہاں ہماری زندگی اِرد گرد کے لوگوں کے لیے قابلِ رشک تھی۔ لوگ اس کا راز جاننے کے لیے آیا کرتے۔
میں انہیں کیا بتاتی کہ رشک بھری زندگیوں میں ایک ساتھی ہمیشہ پاتال میں اتر جاتا ہے!

☆☆☆

ایک دن جب ہمارے شہر میں نئی نویلی دھوپ نکلی تھی اور میں جواد کو ناشتہ کرا رہی تھی' اس نے ڈرتے ڈرتے کہا: ''بینا! ان چھٹیوں میں جنت میرے گھر آنا چاہتی ہے۔''
میرے اُوپر زور زور سے ملبا گرنے لگا۔ خاک اُڑنے لگی۔ شیشے ٹوٹنے لگے...... فلک بوس عمارات زمیں بوس ہونے لگیں۔
جنت' جواد کی سویڈش بیوی سے تھی۔ میں جانتی تھی مگر ہمارے درمیان اس کا ذکر کبھی نہیں آیا تھا۔
میں کرسی سے اُٹھ گئی' وقت دیکھا' نادر کے لیے ناشتہ بنایا' پھر اسے اٹھایا' منہ ہاتھ دھلا کرا سے ناشتے کی میز پر لے آئی۔
اس دوران جواد' نادر سے کھیلتا رہا۔ میں گم صم رہی۔ جواد کو میرے ردِعمل کا اندازہ تھا۔
کھانے کی میز صاف کرنے کے بعد میں نے نادر کو اس کی نرسری میں چھوڑا اَور ایک پل جواد کے پاس ٹھہر کر بولی:
''جنت کو لے آؤ' اگر اُسے ہمارے ساتھ رہنا پسند ہو تو یہیں رہنے دو......''
جواد پر شادی مرگ طاری ہوگئی۔ اس نے کتنی دیر تک مجھے بے یقین سی نظروں سے دیکھا۔ یہ وہ بات ہے۔ کسی زمانے میں جس سے میں شدید نفرت کرتی تھی...... دوسرے کی اولاد کو پالنا! لیکن اب میں نے اپنے آپ کو گھسیٹ کر ملبے میں سے نکالا' دل کی ایک خوشی کے

چھن جانے کے عوض میں نے سوچ لیا کہ اپنے قریب رہنے والے ہر فرد کو وہ خوشی مہیا کر دوں گی جو اس کے دل میں ہے۔

جواد نے مجھے بتایا کہ پہلے تو جنت اپنی ماں کے پاس چلی جایا کرتی تھی مگر اب اس کی ماں نے بھی شادی کر لی ہے اور وہ میرے پاس آنے کے لیے ضد کر رہی ہے۔

جنت جسے ہم سب پیار سے جینی کہتے تھے' ہمارے گھر آ گئی وہ ایک انتہائی مہذب اور پیار کرنے والی بچی تھی۔

میں نے اسے ماں والا پیار دیا' شاید خالی دل کا ایک کونا بھرنا چاہتی تھی۔ وہ ہمارے ماحول میں رچ بس گئی۔ اس نے مجھ سے اُردو سیکھنا شروع کر دی۔ نادر کی دیکھا دیکھی' مجھے امی اور جواد کو اَبو کہنے لگی۔ کرتا شلوار پہننے میں فخر محسوس کرنے لگی۔

کبھی کبھی وہ میری اجازت سے اپنی ماں کو ٹیلیفون کر لیا کرتی تھی۔

ایک دن میرے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی:

''امی جان' کیا ساری پاکستانی مائیں آپ جیسی ہوتی ہیں؟''

''کیوں کیا بات ہے جینی؟'' میں نے اس کا ماتھا چوما (ہاں' پاکستانی مائیں ملبے تلے جو رہتی ہیں!)

کہنے لگی: ''میں نے فون پر اپنی ماما سے آپ کی تعریف کی تھی تو وہ کہنے لگیں' ایشیائی مائیں ایموشنل ہوتی ہیں۔ اس لیے بچوں سے بہت لاڈ کرتی ہیں۔'' (ایموشنز کے سوا ایشیائی ماؤں کے پاس ہوتا کیا ہے' تبھی تو انہیں ٹھیس لگتی ہے تو ریزہ ریزہ ہو جاتی ہیں!)

میرے ساتھ رہتے رہتے' جینی نے میری عادات اپنانا شروع کر دیں۔ ہم نے اسے نزدیک والے کمیونٹی اسکول میں داخل کرا دیا۔ گھر آ کر وہ میرے چھوٹے چھوٹے کام کرنے لگی۔ نادر کے سارے معاملے اُس نے سنبھال لیے تھے۔ تب میں اور جینی ایک کمرے میں رہنے لگے۔ جواد اُور نادر کو دوسرا کمرہ دے دیا تھا۔

جینی نے ہاتھ بٹانا شروع کیا تو میں نے بھی جاب کر لی۔ گھر میں اُور بھی خوشحالی آ گئی۔

ابھی ہم نے اطمینان کا سانس ہی لیا تھا کہ پاکستان سے امی جان کی وفات کی خبر آ گئی۔ میں اپنی امی کو ہر مہینے فون کرتی تھی۔ نادر کی پیدائش پر وہ بہت خوش تھیں اور جنت کے آ جانے سے انہوں نے مجھے بہت دعائیں دی تھیں۔ اب انہیں یقین آ گیا تھا کہ میں نے خوش رہنا سیکھ لیا ہے۔ بس جب سے میں نے جاب کی تھی انہیں باقاعدہ فون نہ کر سکی تھی۔ یوں پانچ سال بعد اچانک پاکستان آنا پڑا......

☆☆☆

وقت کتنی بڑی حقیقت ہے اور ظالم بھی! میں پارک میں چکر لگا کر ایک طرف بیٹھ گئی اور یہ دیکھ کر مجھے سخت تعجب ہوا کہ میں اس کے گیٹ کے آگے سے بے خیالی میں گزر آئی ہوں۔ نظر اٹھا کر بھی اس طرف نہیں دیکھا۔ یہی وہ گیٹ ہے جس کے آگے سے گزرتے ہوئے میرا دل ایک بیٹ مس کیا کرتا تھا۔ اندر لان کو دیکھتے ہی سارا خون چہرے پر آ جاتا تھا۔ اس گھر کو دور سے دیکھ لینا میری بصارت کی معراج تھی۔ کئی بار بے تحاشا مصروفیات میں سے نکل کر دوڑی دوڑی آتی اور دور سے گیٹ کو دیکھ کر بھاگ جاتی۔ مجھے یقین کرنا پڑا کہ مجنوں، لیلیٰ کے کتے سے کیوں پیار کرتا تھا۔ اسی کی نسبت سے مجھے یہ پارک جنت کا تختہ لگتا تھا۔ ہر شے میں نیرنگی اور موسیقیت رچی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اب ہر طرف ایک عام سا منظر تھا۔ کسی چیز میں کوئی خاصیت نہ تھی۔ نہ پھول پودے خمار آلود تھے، نہ ہوائیں اِٹھلا اِٹھلا کر چل رہی تھیں۔

پتا نہیں کس وقت جواد آ کر میرے پاس بیٹھ گئے۔ میرا چہرہ دیکھ کر بولے:

''تم تو پاتال میں اُتری لگتی ہو، کیا بات ہے؟''

میں نے دیکھا، نادر جھیل کنارے بھاگ رہا تھا اور جینی اُسے پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''دوڑیں...... دوڑیں...... وہ دیکھیں دونوں بچے گر جائیں گے!'' جواد بچوں کی طرف لپکے...

میں نے دُور سے اُس کے گیٹ کو دیکھا، لان کے اندر دیکھا، ہر جگہ اُداسی اور اندھیرے نظر آئے۔ گھر بھی اُجڑا اُجڑا سا دکھائی دیا، پھول بھی کہیں نہ تھے......

پتا نہیں وہ کہاں ہوگا۔ اس کی بیوی زندہ ہوگی یا مر گئی ہوگی۔ کیا پتا اُس نے دوسری

شادی کر لی ہو' ممکن ہے اس کے بال سفید ہو گئے ہوں۔ وہ اپنے پراسرار سراپا کے ساتھ اپنے خوبصورت کمرے میں بیٹھا کوئی دھن سن رہا ہو۔

یہ دل کے معاملے بھی نرالے ہوتے ہیں۔ دل سات منزلوں سے کودنے پر آمادہ رہتا ہے۔ زہر بھی تریاق لگتا ہے' مگر ایک ننھی سی پھانس کلیجے میں چبھ جائے تو زندگی بھر نکل نہیں سکتی' دکھی رکھتی ہے' محبت کا جرم' وصال کی آرزو ہے!

عورت مکمل خواب دیکھتی ہے...... جنم سے مرن تک۔ وہ جانتی ہے محبت کا چہرہ سدا ایک جیسا نہیں رہتا...... اُبھرتا' ڈوبتا' بنتا' بگڑتا رہتا ہے۔ اس منصوبے کی اُسے قدم قدم پر سزا ملتی ہے۔ پھر بھی وہ محبت کا ایک الگ سا جہاں لیے بیٹھی ہوتی ہے۔ اس کے لیے وہ تیاگ کرتی ہے' مگر گناہ کی وادی میں قدم نہیں رکھتی۔

محبت تو اُسے بھی مجھ سے تھی' تبھی تو وہ ہر چودھویں چاند کو میلوں کا سفر طے کر کے بھی اس پھولوں بھرے کنج میں آ کے کھڑا ہو جاتا تھا' جہاں میں اسے چاند کا سایہ سمجھ کر ایک نظر دیکھتی اور چلی جاتی تھی۔ اسے ایک نظر دیکھنے کی تمنا' شدت سے دل میں اُٹھی...... یوں' جیسے میں ملبے کے ڈھیر پہ بیٹھی ہوں اور دونوں ہاتھوں سے مٹی کھود کھود کر اپنی کوئی قیمتی شے تلاش کر رہی ہوں...... وہ تو ایک تمنا ہی تھی جو لاوے کی طرح پھٹی اور بھونچال بن کر حواس پہ چھا گئی۔

دوڑ کر جاؤں' گیٹ کو دھکا دے کر کھولوں' لان کو الانگتی پھلانگتی اس کمرے کا دروازہ دونوں ہاتھوں سے دھکیل کر کھول دوں' نیم تاریک کمرے میں اُس کا منور چہرہ دیکھوں' ایسے جیسے وہ آسن جمائے دل کی اندھیاری کوٹھڑی میں براجمان ہے!

شدتِ جذبات سے لرزتی ہوئی میں کھڑی ہو گئی۔ جواد دونوں بچوں کے ہاتھ تھامے ادھر ہی آ رہے تھے۔ میں نے لپک کر نادر کو اُٹھا لیا' سینے کے ساتھ لگا کر بھینچ لیا۔ اس کا منہ چوما۔ (بیٹا میرے دل کو سہارا دو!)

اور پھر پانچ صدیوں سے رُکے ہوئے آنسو' سسکیاں' ہچکیاں امی کے نام پر لگا دیں!

☆☆☆

تَپ

گزرے دِنوں کی بات ہے۔

بی ایس سی کرنے کے بعد مَیں ملازمت کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا۔ تھک ہار کر ایک دن میں نے نسبت روڈ پر ایک ایکسرے کلینک میں نوکری کر لی۔ اپنی بیکاری۔ سے خود اوب چکا تھا۔ اور پھر قسمت نے ڈاکٹر نہیں بننے دیا تھا۔ اس لیے ایکسرے مشین کا آپریٹر بن کر اپنی یہ حسرت پوری کر رہا تھا۔ یہ تجربہ بھی اچھا تھا۔ گونگی مشینیں آدمی کے اندر کی تصویر اُتار لاتی تھیں اور میں روز ایک نئے تجربے سے گزرتا تھا۔

اس روز صبح بڑی زرد اور کملائی ہوئی تھی۔

اچانک ایک لڑکی کلینک میں داخل ہوئی۔ ڈاکٹر راشد اس وقت دوکان میں نہ تھے۔ مَیں اکیلا ہی بیٹھا ہوا تھا۔

''مجھے ایکس رے کرانا ہے''......اس نے مدھم اور اُداس آواز میں کہا۔

''کس جگہ کا......؟''

''چیسٹ کا''......اس نے اپنے ڈاکٹر کی چٹ میرے ہاتھ میں پکڑا دی۔ میں نے اُسے ایک نظر دیکھا اور پھر کہا......''آیئے!''

وہ اندر آ گئی۔ اس نے اپنی آنکھوں پر لگی کالی عینک اُتار دی۔ میری ہدایات پر اس نے اپنی لمبی چٹیا اپنے سر کے اوپر لپیٹ لی۔ میں نے اس کا رُخ مشین کی طرف کر کے اس کے دونوں بازو پکڑ کے اِس کی کمر پر رکھ دیئے، ٹھوڑی تختے کے ساتھ ٹکا دی۔ خود بٹن کے پاس چلا گیا اور کہا لمبا سانس لیجیے......

کھٹ...... ایکس رے اُتر گیا۔ وہ جانے کو مڑی۔ میں نے کہا...... ''ذرا ٹھہریے میں رزلٹ دیکھ لوں۔'' میں جب ڈارک رُوم سے واپس آیا تو وہ پورے دوپٹے سے اپنا آپ ڈھکے مغموم سی بیٹی تھی۔

''آپ کو تکلیف کیا ہے...... ؟'' یہ غیر پیشہ ورانہ سوال تھا مگر میں نے کر ہی دیا۔

''دو مہینے سے کھانسی کی شکایت ہے۔''

''علاج کر رہی ہیں...... ؟''

''جی۔'' ...... اس نے ڈاکٹر کا نام بتایا...... ''اور انہی کے مشورے پر ایکس رے کروانے آئی ہوں۔''

''اچھا تو آپ کل شام سات بجے ایکس رے رپورٹ لے جایئے گا۔ بعض اوقات گلے کی خرابی کی وجہ سے بھی کھانسی ہونے لگتی ہے۔ فکر کرنے کی بات نہیں'' ...... مجھے لگ رہا تھا کہ میں غیر ضروری بات کر رہا ہوں۔ مگر میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اس سے باتیں کروں اور کسی بہانے سے اُسے بٹھائے رکھوں...... اس نے زیرِ لب کچھ کہا یا شاید یونہی اس کے ہونٹ ہلے' یا میرے کان بجے...... اس نے بل ادا کیا۔ اپنی کالی عینک آنکھوں پر لگائی اُور دوکان سے باہر نکل گئی۔ اور مجھے یوں محسوس ہوا' ہوا کا ایک ہلکا جھونکا اندر آیا تھا...... کھڑکیوں کو' دیواروں کو ہلا کر باہر چلا گیا ہے۔

دوسرے دن مَیں گویا اس کے آنے کی دُعا ہی کر رہا تھا کہ وہ آ گئی۔ وہی ٹھہرا ٹھہرا پُر سکون انداز' زرد رنگ اُور نیم وا ہونٹ!

''تشریف رکھیے'' ...... میں نے اُسے بٹھایا اُور ایکس رے والے لفافے ٹٹولنے لگا۔

''آپ کا نام؟'' ...... میں نے تصدیق کے لیے پوچھا۔

''جی تمکنت......''

''یہ آپ کا ایکس رے ہے۔'' ...... میں نے لفافہ آگے بڑھایا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے مَیں کوئی جرم کر رہا ہوں یا کر چکا ہوں۔ یا مجھ سے کوئی ناخوشگوار حرکت ہو گئی ہے۔ کیونکہ کل

شام میں نے خلافِ عادت ڈاکٹر صاحب سے اس ایکس رے کی تفصیلی رپورٹ معلوم کرلی تھی۔

اس نے لفافے میں سے رپورٹ نکالی۔ غور سے پڑھتی رہی۔ پھر اس کے چہرے پر زرد گلاب کی سی کیفیت پیدا ہوئی۔

میں از خود بول اُٹھا...... ''آپ کو بالکل تھوڑی سی تکلیف ہے۔ آپ کا دایاں پھیپھڑا متاثر نظر آتا ہے۔ صرف گول بیر کی گٹھلی جتنا داغ ہے۔ اور یہ اِبتدائی تکلیف دو تین ماہ کے علاج سے رفع ہو جائے گی۔ فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''جی''...... اس کے لب ہلے۔ پھر ایک سوگوار سی ہنسی اس کے ہونٹوں پر اُبھری۔ جیسے بہت سے ارمان اَور آرزوئیں اس کے اندر کھلبلی مچا رہے ہوں اَور وہ ان سے پیچھا چھڑانے کے لیے ہنس پڑی ہو۔

''میں نے کب آپ سے کہا کہ میں فکر مند ہوں؟'' اس نے کالی عینک اُتار دی۔

مجھے اپنے مشورے کے زائد ہونے کا احساس ہوا۔ میں اس کی آنکھوں کو دیکھنے لگا۔ ان میں ایک بھیگا بھیگا سوز اَور رویا رویا سا خمار تھا۔ جس طرح کنول پانی میں ڈوبے رہنے سے کبھی ہنستے ہوئے کبھی روتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ مجھے یوں لگا' اِن خوابیدہ آنکھوں میں حسین خوابوں کی ایک دُنیا پڑی سوتی ہے۔ جو قیامت خیز بن سکتی ہے۔ مگر اس دُنیا کو جگانے سے پہلے اس زندگی کو بیدار کرنے کی ضرورت تھی جو ندی کی ایک سوئی ہوئی لہر کی طرح خشک ہو جانے کا تہیہ کیے ہوئے تھی۔

میں نے اسے دو تین چیسٹ سپیشلسٹ ڈاکٹروں کے پتے بتائے۔

اس کی نم آلود اَور چمک دار آنکھیں دُور خلاؤں میں دیکھتی رہیں۔ پھر اس نے کالی عینک آنکھوں پر لگالی بہت سیانی تھی وہ' کالی عینک کا استعمال غالباً ایسی آنکھوں کے لیے بہت ضروری تھا۔ وہ اُٹھی اَور دھیرے سے باہر نکل گئی' ہوا کے نرم جھونکے کی مانند۔ سڑک پر تانگہ روکا اَور اس میں سوار ہوئی اور لہروں پر رواں کشتی کی مانند نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

کچھ عرصہ بعد مجھے دوائیوں کی ایک لیباریٹری میں جاب مل گیا۔ روزگار کی دلفریبی نے

ذہن سے کئی نقش کھرچ ڈالے۔ دو سال بعد مجھے اس سے بھی اچھی نوکری مل گئی۔ اب میری تنخواہ بھی دو چند ہو گئی تھی۔ اور دونوں چھوٹی بہنوں کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ اور بڑے بھیا مجھے خود پر ایک بوجھ بھی تصور نہیں کرتے تھے۔ چھوٹے سے دو منزلہ مکان کی تیسری چھت پر میں نے اپنے لیے ایک کمرہ اور غسل خانہ بنوالیا تھا۔ بظاہر زندگی کا رویہ بڑا معقول ہو گیا تھا۔ ایک دن ماں بولی: "خالہ ارجمند بڑا زور دے رہی ہیں۔ تجھے ان کی لڑکی آفندہ سے بیاہ کرنا ہوگا۔ میں زبان دے چکی ہوں۔ ایک متوسط طبقے کے آدمی کو اپنے اردگرد کے رشتوں پر ہی اکتفا کرنی چاہیے۔ اپنے پھر اپنے ہوتے ہیں۔ بہت سے عیبوں کا پردہ رہ جاتا ہے۔ زیادہ دھوم دھڑکے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ اور سفید پوشی میں گھر بس جاتے ہیں۔"

اگر گھر بسانا ہی مقصود ہو تو وہ چھوٹے سے دو منزلہ مکان کی تیسری چھت کے ایک دھوپ زدہ کمرے میں، ارجمند خالہ کی بیٹی آفندہ ہی سے سہی.....

(خدا کرے اس معصوم اور مغموم لڑکی کو اب آرام آگیا ہو)

گھر بھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ تیاریاں کیسی، مذاق ہی ہوتا ہے غریبوں کے ساتھ.....لوگ تو دو چار دن بندھی ٹکی زندگی سے اِدھر اُدھر ہو کر خوش ہو جاتے ہیں۔

جس روز بارات گھر میں واپس آئی اور آفندہ کو دُلہن بنا کر تیسری چھت کے روشن کمرے میں لایا گیا، میں اپنی کھڑکی میں کھڑا ہو کر بازار کا نظارہ کر رہا تھا۔ محلے کے اتنے گھروں میں ہمارا گھر الگ تھلگ لگ رہا تھا۔ اس پر روشنیوں کی دو لڑیاں لٹک رہی تھیں اور صاف پتہ لگ رہا تھا، اس گھر میں دُلہن آئی ہے۔

میں نے مڑ کر دیکھا، آفندہ دُلہن بنی پلنگ پر بیٹھی تھی، اور میری بہن کبھی کی جا چکی تھی۔ کمرے میں بہت سے پھول نظر آرہے تھے۔ گلاب کے کم اور گیندے کے زیادہ۔ غریبوں کی شادیاں گیندے جیسے پھولوں ہی سے بج جاتی ہیں۔

اچانک میرا خیال زقند بھر کے کھڑکی سے باہر نکل گیا۔

(خدا کرے اس اجنبی کھردری لڑکی کو آرام آگیا ہو، خدا کرے اسے اچھا سا ڈاکٹر مل گیا ہو)

گھر کو بسے ہوئے ایک سال بھی ہوگیا۔ ایک منا آیا اور چلا بھی گیا۔ یہ گھر بسنے کی بیّن دلیل تھی، ورنہ محلے دار مشکوک ہی رہتے۔ شکر ہے، سب اس یقین میں رہے کہ آفندہ اور کلیم دونوں بہت خوش ہیں۔ تیسری چھت کا یہ اکلوتا کمرہ بڑا ہی نامعقول تھا۔ گرمیوں میں یہاں قیامت کی گرمی ہوتی، تپش اور حبس جان نکالے ڈالتیں۔ اور سردیوں میں یہ گرم ہونے سے ایک دم انکار کر دیتا۔ گرما کی غضبناک دوپہریں مَیں اپنے دفتر کے ٹھنڈے کمرے میں گزارنے لگا تھا اور سردیوں کی طویل راتوں میں مَیں نیچے اپنی ماں کے پاس چلا جاتا۔

ماں سب سے نچلی منزل میں رہتی تھی، بڑے بھیا دوسری منزل میں۔ اگر میں تیسری منزل پر یہ کشادہ کمرہ نہ بنواتا تو شاید مجھے گھر بسانے کا حق بھی نہ دیا جاتا۔ دوسرے لفظوں میں تیسری چھت کا یہ کمرہ بسانے کے لیے ہی میں نے شادی کی تھی، جہاں بے چاری آفندہ سردی گرمی میں پڑی کڑھتی رہتی تھی۔ خدا کے فضل سے اس کا ساس اور جٹھانی کے ساتھ دل نہیں ملا تھا۔ آمنا سامنا ہمیشہ ''تو تو میں میں'' پر ہی منتج ہوتا۔ نتیجتہً دونوں طرف سے کوسنے مجھے ہی سنائے جاتے۔ مجھ میں نہ تو اتنا یارا تھا کہ اُوپر والے کمرے کو ایئرکنڈیشنڈ کروا دوں اور نہ اتنی ہمت کہ ماں سے اپنا حق مانگوں۔

کبھی کبھی جب تپتی ہوئی دوپہر میں سر کو گیلے تولیے سے لپیٹے، مَیں تیسری چھت کے کمرے میں داخل ہوتا تو آفندہ بھرے غبارے کی طرح پھٹ پڑتی......

میں سر کے ساتھ منہ بھی لپیٹ لیتا اور سوچا کرتا......

(خدا کرے اس لڑکی کو آرام آ گیا ہو، زمانے کے سرد و گرم نے اس کو مایوس نہ کر دیا ہو، اب اس کے ٹھہراؤ میں تھوڑی سی ہلچل پیدا ہوگئی ہو)

آفندہ تیسری چھت کے اس کمرے میں لکشمی دیوی بن کر نہیں آئی۔ چنانچہ ہم دونوں کشمکشِ حیات سے نبرد آزما رہے۔ یہیں پر اس نے مزید دو بچوں کو جنم دیا اور دو دفعہ میری نوکری جاتی رہی۔ ملازمت بھی آج کل کے زمانے میں پنسلین کا انجکشن بن گئی ہے۔ اگر راس نہ آئے تو خاتمہ کر دیتی ہے۔ ہاتھ پاؤں مارنے سے وقت گزر رہا تھا۔ مگر آسودگی شاید نصیب

میں نہیں تھی۔ پھر جلنے کڑھنے والی اور ہر دم بچوں پر چیخنے چلانے والی آفندہ نے بیمار رہنا شروع کر دیا۔

غربت اور بیماری کا ساتھ سائے جیسا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سایہ اندھیرے میں غائب ہو جاتا ہے مگر بیماری کا سایہ غربت میں آگے آجاتا ہے۔ اس کی نت نئی شکایتوں نے مجھے بیزار کر دیا' اس سے دُور کر دیا اور راتوں کو جب وہ مسلسل کھانسے جاتی تو میں گھبرا کر اپنے آپ سے پوچھا کرتا...... (کیا اس لڑکی کو آرام آگیا ہوگا جسے ہلکی ہلکی کھانسی پریشان کیا کرتی تھی....)

آخر وہ وقت آگیا جب عزیزوں کے اصرار پر مجھے آفندہ کو ایک خیراتی ہسپتال میں داخل کرانا پڑا۔ چار سال سے وہ ایڑیاں رگڑ رہی تھی۔ اب پانچواں سال لگا......

سات سال کی منی اور پانچ سال کا ککو میرے لیے مستقل سر درد بن کر رہ گئے تھے......

رات کو جب ککو ماں کو نہ پا کر رو دیا کرتا تو میں سر پکڑ کر بیٹھ جاتا' اور دل میں دُعا کرتا......

(خدا کرے اس نکھری نکھری لڑکی کو آرام آگیا ہو...... وقت اس پر مہربان ہو گیا ہو......)

چھ ماہ پہلے ڈاکٹروں نے آفندہ کو جواب دے دیا تھا۔ میں اسے گھر لے آیا تھا۔ آج اس نے بہت خون تھوکا۔ آج اس کا چہرہ بہت خوفناک ہو گیا تھا۔ مجھے بلا کر اس نے دونوں بچوں کے ہاتھ میرے ہاتھ میں تھما دیئے اور مجھ سے ہاتھ جوڑ کے اپنی سب کوتاہیوں کی معافی مانگی۔ آج زندگی میں پہلی بار میں نے آفندہ کو غور سے دیکھا۔ وہ بڑی خوبصورت لڑکی تھی۔ میں نے اس کی خوبصورتی کی قدر نہیں کی تھی۔ تیسری چھت کے بیدرد کمرے اور اپنی کج روی سے اسے موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔ اگر میں اس کی پروا کرتا تو وہ ایک خدمت گار بیوی بن سکتی تھی۔ میں اس کو دوا' دُعا کچھ بھی نہ دے سکا تھا۔ اب تو ڈاکٹروں نے اسے زیادہ باتیں کرنے سے بھی منع کر دیا تھا۔

مگر اس نے کہا کہ وہ آج مجھ سے بے شمار باتیں کرنا چاہتی ہے...... خواہ اس کے بعد وہ کبھی نہ بول سکے۔ میں نے چاہا' آج میں بھی اسے جی بھر کر تسلی دوں اور اپنی بدسلوکیوں کا اعتراف کرلوں۔ اس سے اظہارِ محبت کروں اور کہوں...... ''آفندہ! فکر کیوں کرتی ہو میں تمھیں

ہر حالت میں بچالوں گا' خدا اِتنا بے رحم نہیں ہے۔ تمھیں اپنے دونوں بچوں کے لیے جینا ہوگا۔ میرے لیے زندہ رہنا ہوگا۔ میں تمھارے لیے کسی بہت اچھے سپیشلسٹ کا بندوبست کروں گا۔ روپیہ پانی کی طرح بہادوں گا۔ تمھیں ضرور آرام آجائے گا۔ میں آج ہی تمھیں کسی بڑے اچھے ہسپتال میں داخل کرادوں گا۔ میں دن رات تمھاری پٹّی کے ساتھ جڑ کر بیٹھا رہوں گا''......مگر یہ سب کہنے کی بجائے میں سوچ رہا تھا......خدا کرے وہ معصوم اور مغموم لڑکی بچ گئی ہو' اسے تیسری منزل کا منحوس کمرہ نصیب نہ ہوا ہو' اللہ نے اس کو لمبی عمر دے دی ہو۔ اس کی آنکھوں کی نمی میں سوگواری کی بجائے چاند اُتر آیا ہو۔ اس کی کھانسی کو آرام آ گیا ہو...... اس کے پھیپھڑے پر بیر کی گٹھلی جیسا نشان مٹ گیا ہو......وہ خوش وخرم ہو......اس کے روشن چہرے سے کسی گھر کی پیشانی دمک رہی ہو!

افسانچہ

محبت کے موسم

پہلے دونوں ایک دوسرے پر مرتے ہیں......

پھر ایک دوسرے سے جلتے ہیں......

پھر ساری زندگی ایک دوسرے کو جلانے میں بسر ہو جاتی ہے۔

جیتے جی...... ایک دوسرے کو' ایک دوسرے کی صرف کوتاہیاں اور عیب ہی نظر آتے ہیں۔

ان دونوں میں سے اگر ایک مرنے میں پہل کرے تو پھر اس کی صرف خوبیاں اُجاگر ہونے لگتی ہیں۔ اُس جیسا دُنیا میں نہ کوئی تھا نہ کوئی ہوگا۔ باقی کے موسم اُس کی یاد میں بسر ہونے لگتے ہیں......

گویا پھر سے محبت کا موسم شروع ہو جاتا ہے۔ اگر دونوں میں سے ایک جی کڑا کر کے مر جائے......

پر اختیار میں بھی ہو!

☆☆☆

درمیان والی

دفعتاً درمیان والی نے ضد شروع کر دی کہ اس کی شادی کر دی جائے۔ اِسے پڑھائی وڑھائی کا بالکل شوق نہیں تھا۔ ماں کہتیں...... کم از کم میٹرک تو پاس کر ہی لے۔ یہ زمانہ کوری جہالت کا نہیں۔ مگر اس نے کتابیں جلا دیں۔ یونیفارم قینچی سے تار تار کر دیا اَور کنڈی چڑھا کے کمرے کے اندر بیٹھ گئی۔ ماں نے ہر حربہ آزمایا' پچکارا بھی اور مارا بھی' فاقے کی سزا بھی دی......

بالآخر ماں ہار گئی۔ بھید یہ کھلا کہ اس کی جماعت میں اس کی ایک سہیلی پڑھتی ہے' جس کا بھائی برتنوں کی ایک فیکٹری میں ظروف ساز ہے۔ وہ سائیکل پر بہن کو لینے سکول آیا کرتا ہے۔ اسی کے نام پر درمیان والی نے تیاگ لیا تھا۔ ماں بھی کیا کرتی۔ شوہر کے مرنے کے بعد اس نے وہی کام شروع کر دیا تھا' جو شادی سے پہلے کیا کرتی تھی۔ شوق کے کسی خوش رنگ مرحلے پر اس نے شادی تو کر لی تھی' مگر اپنی شادی سے خوش نہ تھی۔ عاشقی کے زمانے میں اس کا شوہر اپنی جدی جائیداد اُس پر نچھاور کر چکا تھا۔ اب تو اُس کے پاس دینے کو بس عزت دار زندگی ہی تھی۔ اسے ازدواجی زندگی میں' عیش بھری راتیں اور آرام میں گوندھے دن نہ ملے' اور اُوپر تلے تین بیٹیاں ہو گئیں۔

بظاہر تو وہ اپنے شوہر سے کچھ نہ کہتی تھی مگر اندر ہی اندر جلتی کڑھتی رہتی۔ شریفانہ زندگی کے شب و روز میں اسے کوئی چارم نظر نہیں آتا تھا۔ عام گھریلو عورت کی زندگی پر وہ نفرین بھیجنے لگی تھی۔ اس کی بے حسی اَور ہر دم کی بیزاری نے اس کے شوہر کی جان لے لی تھی۔

درمیان والی کی ضدی طبیعت کو سزا دینے کا بس یہی ایک طریقہ تھا کہ اس کی شادی سائیکل والے کے ساتھ کر دی جائے۔ اس کی شادی کے بعد اس نے اپنا وہی پرانا کسب شروع کر دیا۔ ابھی اس میں دم خم تھا۔ ساتھ ساتھ اس نے بڑی کو گانے کی تربیت دینا شروع کر دی۔ بڑی کی آواز اچھی تھی۔ وہ گیت سنگیت کی محفلوں میں بڑی کو ساتھ لے جانے لگی۔ بڑی کو ہنر مندی سے متعارف کروانے لگی' وہ متعارف کروانے اور نظروں میں لانے کے سارے داؤ پیچ خوب جانتی تھی۔ نظروں کی گرمی نے بڑی کے جوبن کو بڑی جلدی اُبھارا......

دیکھتے دیکھتے وہ ایک مستی بھری غزل بن گئی......

بڑی کے اُندر گُن بھی سارے کنجریوں والے تھے۔ اتنی جلدی اس نے چمکتی ڈگر پر قدم جمائے کہ ماں بھی حیران رہ گئی۔ ابھی اس کی عمر اٹھارہ سال کی تھی مگر پورا شہر اس کا دیوانہ ہو گیا تھا۔

بڑی کا شہرہ کیا ہوا کہ ان دِن پھر گئے۔ دیکھتے دیکھتے ماں نے ایک جدید ترین کالونی میں خوبصورت سا گھر خرید لیا۔ دروازے پر موٹر آ گئی۔ رات گئے تک بڑوں بڑوں کی بڑی بڑی موٹریں اس کی کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں نظر آنے لگیں۔ ٹی وی والے چکر لگاتے نہ تھکتے۔ کوئی ڈرامے کی آفر لا رہا ہے' کوئی فلمی دُنیا کے خواب فروخت کر رہا ہے' کوئی نوٹوں کے فرش پر مجرا کرنے کی نوید دے رہا ہے......

چاند اس کے آنگن سے طلوع ہونے لگا اور سورج اس کے دروازے پر دستک دے کر ڈوبنے لگا۔ رات بھر مجرا ہوتا...... نوٹوں کی بارش ہوتی' عاشقوں کی آزمائش ہوتی' ماں کی فرمائش ہوتی۔ دوپہر کو وہ سو کر اُٹھتی' ماں صدقے واری ہو کر ناشتہ کرواتی۔ سہ پہر سے لے کر شام تک وہ کسی بیوٹی پارلر میں وقت گزارتی۔ رات کی محفل کا سرور اتنا ہوتا کہ اس کے انگ انگ سے شراب پھوٹی پڑتی۔ شیشہ دیکھتی...... اتراتی...... بال بنواتے ہوئے اتراتی...... آنکھیں مٹکاتی اور اتراتی...... پارلر میں موجود ہر عورت اس کو پلٹ کر ضرور دیکھتی۔ اور وہ ہر عورت کو یوں دیکھتی جیسے اس نے اس کا شوہر اپنے پاؤں کی جوتی تلے دبا رکھا ہے۔ سڑک پر

جاتا ہوا ہر مرد اُسے اپنا غلام لگتا......

وہ جانتی تھی، اگر وہ بھولے سے مسکرا دے تو راہرو اپنا رستہ بھول جائیں گے۔ گویا وقت کی مہار اس کے اپنے ہاتھوں میں تھی۔

ماں سیانی تھی۔ اپنا عروج و غروب دیکھ چکی تھی۔ ہر رات بولی بڑھا دیتی تھی۔ ایک رات کے مجرے کا ایک لاکھ روپیہ کہتی تو پانچ لاکھ اِدھر سے ہو جاتے۔ پایل کی چھم چھم کے ساتھ اس کے گھر میں دھن برسنے لگا۔ ایسے میں دل پھینک تو برساتی پتنگوں کی طرح نکل آتے ہیں...... ایک کے پیچھے ایک......

سارا دِن ماں کو دلالوں کے فون آتے رہتے۔ ماں کا نخرہ بھی سوا نیزے پر پہنچ چکا تھا۔ ماں نے دُور اندیشی کا ایک اور کام کیا۔ چھوٹی کو اپنے پہلے گناہ کی طرح چھپا لیا۔ یعنی اسے دُور دراز کے ایک ہوسٹل میں داخل کرا دیا۔ اسے دورانِ تعلیم کسی کو اپنا اَتہ پَتہ بتانے کی اجازت نہ تھی۔ یوں وہ ہوسٹل میں بھی شاہانہ انداز سے رہتی تھی۔ دوستانہ بھی اس نے ہائی سوسائٹی کی لڑکیوں کے ساتھ رکھا تھا۔ ہم جولیاں بھی سمجھتیں، وہ کسی بڑے اور رئیس گھرانے کی بیٹی ہے۔

درمیان والی کا شوہر اُسے اِس شہر سے دُور اپنی فیکٹری کے کوارٹر میں لے گیا تھا۔ اسے ماں کے گھر آنے کی اجازت نہ تھی اَور ماں نے بھی تو کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے کیے کو خود بھگتے گی۔

دس سال تک بڑی نے شہر میں قیامت بپا کیے رکھی۔ کون تھا جو اس کی زلف کا اسیر نہ ہوا...... کون اس کی چشمِ فسوں ساز کے وار سے بچ سکا...... اور کون اس کے میخانۂ بدن سے ایک گھونٹ کا طلب گار نہ ہوا۔ اس نے لاتعداد ہنستے بستے گھر ویران کیے، سینکڑوں تجوریاں خالی کر دیں۔ بیٹے کو باپ سے لڑایا اور باپ کو دُنیا میں رُسوا کیا۔ وہ اس دُنیا کو بازیچۂ جمال سمجھ بیٹھی تھی۔ ہر رئیس زادہ اَور صاحب زادہ اُسے اپنے حبالۂ نکاح میں لانے کو مضطرب نظر آتا، مگر وہ قہقہہ لگا کر کہتی کہ اُسے تو ہر رات کی دُلہن بننے کا شوق ہے...... اسے ہر رات نئے حجلۂ عروسی کی ضرورت ہے۔ وہ تو گھسی پٹی اور روتی بسورتی روٹین لائف گوارا نہیں کر سکتی۔ راحتوں میں گندھی ہوئی ایک شاہانہ زندگی میں امروز و فردا کی گھٹن نہ ہو۔ دس سال کی سپوتنک پرواز کے

بڑی کے بدن کا کلف ڈھیلا ہونے لگا...... بھونرے اُڑنے لگے' عاشق بہانے تراشنے لگے' قیمتیں گرنے لگیں' راتیں سکڑنے لگیں' گھونگھرو فریاد کرنے لگے' ڈیوڑھی ویران ہونے لگی...... تو ماں نے بڑے سلیقے سے چھوٹی کو لانچ کر دیا۔

چھوٹی تو خود شعلۂ جوالہ بن چکی تھی۔ ماں کا سارا رُوپ اُس پر اُتر آیا تھا۔ گر یجوایشن نے سونے پر سہاگہ کر دیا۔ محفلوں میں نشست و برخاست کے آداب اس نے اپنی خاندانی سہیلیوں سے سیکھ لیے تھے۔ اداؤں میں لپیٹ کر انگریزی بولنے لگی تھی۔ اس کی آواز میں رس تھا۔ ماں نے اَندر خانے موسیقی کی تربیت دے لی تھی۔ خدا جانے یہ سب اس کے لاشعور میں تھا یا اس نے اس حالات کو نظریۂ ضرورت کے تحت قبول کر لیا تھا۔ وہ تو جیسے وقت کی مہارانی بن جانے پر تلی بیٹھی تھی۔

پھر وقت کا پہیہ چھوٹی کے گرد گھومنے لگا......

اگرچہ ہر محفل میں دونوں بہنیں ایک ساتھ جاتیں مگر دیکھنے والوں کی نظریں صرف چھوٹی کا طواف کرتیں۔ چھوٹی کی فرمائشیں آتیں...... چھوٹی کے طالب آتے...... چھوٹی کے فون آتے......

بڑی کلیجہ مسوس کر رہ جاتی۔ یہی وہ لوگ تھے جو کچھ سال پہلے اِس کی راہ میں دِل بچھاتے تھے' آنکھیں بچھاتے تھے۔ مر مر جاتے تھے' فرمائشیں پوری کرتے نہ تھکتے تھے۔ زندگی اس کے نام لگانے کا جتن کرتے تھے' محبت کی قسمیں کھاتے نہ تھکتے تھے۔ شادی کے لیے اصرار اتنا بڑھ جاتا کہ خودکشی کی دھمکیاں دینے لگتے تھے۔ اُسے اپنی قسمت کا ستارہ کہتے تھے' زندگانی کا چاند کہتے تھے۔ اور کبھی نہ بجھنے والی شمع کہتے تھے اَور اب انہی کی آنکھیں چھوٹی پر لوٹ پوٹ ہوتی تھیں' چھوٹی پر نثار ہوتی تھیں۔ وہ اگر کہیں مجرا بھی کرنا چاہے تو صاف اِنکار ہو جاتا تھا۔ کہتے کہ چھوٹی ہی چاہیے۔ راتیں چھوٹی کی تھیں' محفلیں چھوٹی کی تھیں' عاشق چھوٹی کے تھے...... سارا شہر چھوٹی کا تھا۔

بڑی کو ڈیپریشن کے دورے پڑنے لگے۔ وہ چڑچڑاتی' چیختی چلاتی...... بات بات پر

غصہ کرتی۔ چھوٹی سے اُلجھ اُلجھ پڑتی......

ماں نے سمجھایا کہ دُنیا کی ریت یہی ہے۔ بیمار ہو جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ڈاکٹروں کے چکروں میں روپیہ برباد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حالات کو قبول کر لینے میں ان تینوں کا فائدہ ہے۔

ماں نے تھوڑا سا نشہ لگا دیا۔ وہ شانت ہو گئی۔ اب دونوں محفل محفل جاتیں یا گھر میں کوٹھا سجاتیں۔ بڑی گیت گاتی' چھوٹی رقص کرتی اور ماں نوٹ چنتی۔

کبھی کبھی چھوٹی کو مستی میں سرشار دیکھ کر بڑی کہتی: چھوٹی یہی وقت ہے' تو کسی اچھے مالدار آدمی کے ساتھ شادی کر لے"۔

"تھو!" وہ تنک کر کہتی...... "میں تین حرف بھیجتی ہوں شادی پر۔ میں لائف انجوائے کروں گی"۔ وہ اپنے تجربے بتانے لگتی۔ "یہ لوگ تیرے چکنے گال نوچ کر کھا جائیں گے۔ ان بالوں کی گھٹاؤں کی سیاہی پی لیں گے۔ تیرے لیے باقی کچھ نہیں چھوڑیں گے"۔

"تو مجھ سے جلتی ہے۔ تجھ سے میرے عاشق دیکھے نہیں جاتے۔ اپنا زمانہ عیش میں گزار لیا اور مجھے گھر بیٹھنے کا مشورہ دیتی ہے۔ درمیان والی کو دیکھ لیا ہے۔ کیسی گھٹیا زندگی بسر کر رہی ہے۔ عید کے عید بھی اسے نیا کپڑا نصیب نہیں ہوتا۔"

☆☆☆

درمیان والی کو ماں کے گھر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہو گئیں تھیں۔ کبھی کبھی تہوار پر ماں کی محبت جوش مارتی تو وہ اپنی شاندار موٹر میں اس کے کوارٹر میں جا نکلتی۔ درمیان والی گھر کے کاموں میں جُتی ہوتی۔ اس کے تن پر معمولی کپڑے ہوتے۔ دوپٹہ قمیض سے اور قمیض شلوار سے میچ نہ کرتی۔ پاؤں میں پھٹے سلیپر ہوتے۔ چہرہ بے رونق ہوتا۔ برتن مانجھ مانجھ کر ہاتھ بوڑھے لگتے۔ آنکھیں تھکی تھکی اور ہونٹ نیلاہٹ پر مائل لگتے۔ حالانکہ ماں بتاتی تھی کہ درمیان والی ان دونوں سے خوبصورت تھی۔ اس کا ناک نقشہ ہو بہو اپنی نانی پر تھا جو کہ ایک ڈیرے دار طوائف تھی اور درباروں تک اس کی رسائی تھی۔

ماں ناک پر کپڑا رکھ کے اس کے کوارٹر میں جاتی۔ وہ گھر بھر کے کپڑے دھونے میں جُتی ہوتی یا بچوں کو ہوم ورک کروا رہی ہوتی۔ ماں مٹھائیوں کے ڈبے اور پھلوں کے کریٹ لے کر جاتی۔ وہ ایک طرف پڑے رہتے۔ ماں اسے دس پندرہ ہزار روپے دینا چاہتی، وہ انکار کر دیتی۔ ماں کہتی: ''رکھ لے، کام آئیں گے۔ تیرے شوہر کو کیا پتہ چلے گا''۔

وہ کہتی: ''نہ ماں، ایک بار آپ سے پیسے لے لیے تھے، منے کی بیماری پر کام آئے۔ میں اپنے شوہر کے اعتماد کو دھوکا نہیں دوں گی''۔

ماں تحفے تحائف دے کر رخصت ہو جاتی۔ اُس کا شوہر آتے ہی کہتا: ''اِن چیزوں کو اُٹھا کر باہر گلی میں پھینک دو''۔ وہ پھینک دیتی۔

☆☆☆

چھوٹی نے تو شہر میں ایسی تھرتھلی مچائی کہ رقیبوں کی ہاتھا پائی ہونے لگی۔ دشمنیاں بڑھنے لگیں۔ دھمکیوں کے فون آنے لگے۔ چھوٹی کے لیے امیر زادوں میں شرطیں لگنے لگیں۔ سیاسی شخصیات کے لیے وہ عزتِ نفس کی علامت بن گئی۔ اس کی بولی اتنی چڑھ گئی کہ خود چھوٹی کا دماغ چڑھ گیا۔

انہی دِنوں میں ماں اچانک بیمار رہنے لگی۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ ریڑھ کی ہڈی کا کینسر اپنی آخری سٹیج میں ہے۔ ماں مہینوں کی بجائے دنوں میں یوں چلی گئی جیسے تنور پر برف کی سل رکھ دیں تو گھل جاتی ہے۔

ماں کی جگہ بڑی نے سنبھال لی۔ اپنے آپ وہ نائیکہ بن گئی۔ پھر بھی کبھی کبھی وہ چھوٹی سے کہتی: ''کوئی مناسب بندہ دیکھ کر شادی ضرور کر لے''۔

''ماں نے کیا پایا تھا شادی کر کے؟'' وہ کہتی...... ''اُسے واپس اس دنیا میں آنا پڑا۔ تم فکر نہ کرو۔ میں بڑھاپے سے پہلے اتنی دولت جمع کر لوں گی کہ ہم دونوں آرام سے بیٹھ کر کھائیں گی''۔

چھوٹی ابھی اپنی پرواز کے نصف النھار پر تھی کہ ان کی کوٹھی میں ایک حادثہ ہوگیا۔ مجرا

سنتے ہوئے دو مختلف سیاسی گروپوں کے رئیس زادوں کی آپس میں لڑائی ہوگئی۔ کلاشنکوف بردار تو دونوں کے ہمراہ تھے۔ بات بڑھی تو کلاشنکوف چل گئی۔ ان میں سے ایک قتل ہو گیا اور دوسرا ساتھیوں سمیت فرار ہو گیا۔ متوفی کے والدین صاحب اثر و رسوخ تھے۔ اُنھوں نے چھوٹی کو اَندر کروا دیا۔

پھولوں اور خوشبوؤں کے ڈھیر سے اُٹھ کر چھوٹی جیل کی کال کوٹھڑی میں جا بیٹھی۔ سان وگمان میں بھی نہ تھا کہ قیامت کیسی ہوتی ہے۔ قیامت تو جیل کی کوٹھڑی میں ہر رات کے ساتھ طلوع ہوتی رہی۔

جن لوگوں کی قسموں اور محبتوں پر اتراتی تھی' ان کو فون کروا کروا کے تھک گئی۔ جو اس کی راہ میں جان دینے پر آمادہ رہتے تھے ان کی راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھر ہو گئیں۔

بھاگ دوڑ کرتے کرتے بڑی تھک گئی۔ کوئی باہر نہیں نکلا۔ سب نے یوں آنکھیں پھیریں جیسے کبھی شناسا نہ تھے۔ تب بڑی نے روپیہ پانی کی طرح بہا دیا۔ موٹر بک گئی' زیور بک گیا' بالآخر گھر بھی بک گیا۔

دو سال بعد چھوٹی کو قید سے رہائی تو مل گئی' مگر ایسی صورت میں باہر آئی کہ صدیوں کی بیمار لگتی تھی...... یوں جیسے چہرے کے پھول کا رس شہد کی مکھیاں نکال کر لے گئی ہوں!

دونوں بہنوں نے تھوڑی بہت بقایا پونجی سے ایک گمنام علاقے میں ایک چھوٹا سا کوارٹر خرید لیا اور خفیہ زندگی بسر کرنے لگیں۔

☆☆☆

ایک روز ایک بڑی شاندار موٹر اُن کے کوارٹر کے باہر آ کر رُکی۔ دونوں کے دل دھڑک اُٹھے...... پرانی یادوں کا گلابی رنگ چہرے پر لہرا گیا...... شاید کہ کسی چاہنے والے کو اُن کی یاد آ ہی گئی...... بے تابی سے بوری کا پردہ اُٹھا کر دیکھا' ایک بڑی سی کار میں سے ایک شاندار سی عورت نکل رہی تھی۔ وہ جب اس بدبو دار کوارٹر کا پردہ ہٹا کر اَندر داخل ہوئی تو اس کے پیراہن کی خوشبو سے سارا کوارٹر مہک اُٹھا۔

دونوں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا' وہ درمیان والی تھی۔ اس کی صحت قابلِ رشک تھی۔ اس کی دونوں کلائیاں طلائی چوڑیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ کانوں میں ڈائمنڈ کے ٹاپس اور گلے میں ہیروں کا اللہ والا لاکٹ تھا۔ تن پر بیش قیمت سوٹ تھا......

دونوں کو حیرت زدہ دیکھ کر مسکرائی اور بولی: ''بیٹھنے کو نہ کہو گی؟'' پھر خود ہی غلیظ سی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی......

''بڑی مشکل سے تمھارا پتہ چلا ہے۔ میں تو ملک سے باہر چلی گئی تھی نا! یہاں کے حالات کا پتہ ہی نہ چلا۔ میری دونوں بیٹیوں کی شادیاں ہو گئیں ہیں۔ بڑا بیٹا شادی کے بعد آسٹریلیا میں رہتا ہے۔ چھوٹا بیٹا جاپان سے چینی کے برتن بنانے کی تربیت لے کر ہمارے ساتھ واپس آ گیا تھا۔ پاکستان آتے ہی میرے شوہر نے چھوٹے بیٹے کے ساتھ مل کر چینی کے برتن بنانے کا کارخانہ لگا لیا تھا۔ ڈیفنس میں ہماری کوٹھی ہے''۔

بڑی اور چھوٹی منہ کھولے اُس کی باتیں یوں سُن رہی تھی جیسے کوہ قاف سے کوئی پری اُتر آئی ہو اور اُنھیں مافوق الفطرت کہانی سُنا رہی ہو۔

''میری موٹر میں کچھ سامان پڑا ہے وہ میں آپ دونوں کے لیے لائی ہوں۔ کپڑے بھی ہیں اور سامان خورد و نوش بھی!''

اس نے پرس سے کڑکڑاتے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی' ان کی طرف بڑھا کر بولی......''
ہم ہر سال لاکھوں روپے کی زکوٰۃ دیتے ہیں۔ یونہی مجھے خیال آ گیا تھا۔ اوّل خویش بعد درویش!!''

☆☆☆

چُپ

وہ کئی دنوں سے بے سدھ پڑی تھی۔ سارے ضروری ٹیسٹ ہو گئے تھے۔ رپورٹیں بھی آ چکی تھیں، نیا ڈاکٹر اندر آ گیا۔ اِس ڈاکٹر کو لاس اینجلس سے بطور خاص بلوایا گیا تھا۔ ڈاکٹر قریب آیا، مسکرایا'' یہ تعارفی مسکراہٹ تھی۔ پھر وہ پرفارما اُٹھا کے پڑھنے لگا جسے مریضہ نے اُس کی آمد سے پہلے پُر کر کے رکھ دیا تھا۔ یہ طریقۂ کار اُسے بہت اطمینان بخش لگا تھا۔ جب وہ اِس ہسپتال میں داخل ہوئی تھی تو بارہ صفحات پر مشتمل ایک پرفارما اُسے دیا گیا تھا، جس میں اس کی پیدائش سے لے کر اب تک کی زندگی کے بارے میں انتہائی ضروری سوالات کے جواب پوچھے گئے تھے۔ جو جو بیماریاں ہوئیں، جیسے جیسے حادثات پیش آئے...... حتیٰ کہ ماں باپ کی بیماریاں اور ان کے خانگی معاملات ے بارے میں بھی پوچھا گیا تھا۔ جذباتی واقعات اور ازدواجی تعلقات سے متعلق شاید ہی کوئی سوال ہو جو رہ گیا ہو۔ بہت سے تلخ حقائق جو مریض بوجوہ اپنی زبان سے ادا نہیں کر سکتا، اُنھیں برملا بیان کر دینے کا یہ تحریری طریقہ خوب تھا۔ پھر اُسے مناسب وقت بھی دیا گیا تھا، اس فارم کو پُر کرنے کے لیے۔ چھ اَوراق کا یہ پلندہ ڈاکٹر نے متجسس آنکھوں اَور متبسم لبوں کے ساتھ پڑھا۔ پڑھنے کے بعد اُس نے دوبارہ پاکستانی فزیشن کی رپورٹ دیکھی۔ پھر آ کر اِس سٹول پر بیٹھ گیا' جو پلنگ کے پاس رکھا ہوا تھا۔ اور سرگوشی جیسی ملائمت کے ساتھ یوں باتیں کرنے لگا جیسے سفید روئی کے پھاہے' زخموں پر رکھتا جا رہا ہے۔

''تشویش کی کوئی بات نہیں' تم تو صورت سے صحت مند دکھائی دیتی ہو۔ تمھاری آنکھوں کی چمک تمھارے دلِ زندہ کی چغلی کھا رہی ہے' اَور تمھارے چہرے کے نقوش بتاتے ہیں کہ

تمھارے اندر بلا کی خود اعتمادی اور قوتِ ارادی ہے۔"
وہ سارا وقت ڈاکٹر کے چہرے پر نظریں گاڑے تکتی رہی۔
بات ختم کر کے ڈاکٹر نے جب داد لینے والے انداز میں اُس کی طرف دیکھا تو وہ اُداسی سے مسکرادی۔ یہ ماہر نفسیات سب ایسے ہوتے ہیں..... ماں کی طرح مہربان، استاد کی طرح شفیق۔

"تمھاری بیماری بھی اتنی پیچیدہ نہیں ہے"...... وہ دوبارہ گویا ہوا..... "بلکہ اسے بیماری نہیں کہتے۔ محض ایک حادثہ کہتے ہیں۔ اتفاقات تو اچھے برے زندگی میں ہوتے رہتے ہیں...... ہے نا؟" اس نے اپنی بنٹے جیسی آنکھیں گھمائیں اور پھر مسکرایا۔ "تمھارے پہلے فزیشن سے میری تفصیلی میٹنگ ہو چکی ہے۔ بس تم اپنے ذہن اور زبان کو ریسٹ دو۔ اگر تم انھیں آرام نہیں دوگی تو یہ احتجاجی طریقہ اختیار کریں گے۔ جیسے اب کیا ہے۔"
وہ کھڑا ہو گیا، اس کا کندھا تھپتھپایا۔
"تم بالکل پہلے کی طرح چہچہانے لگو گی! میں دوائیاں نہیں دیتا۔ باتیں بہت کرتا ہوں۔ لوگ مجھے باتونی ڈاکٹر کہتے ہیں، تم نے بھی میرا "نک نیم" سنا ہوگا۔"
"پر میں کیا کروں!" وہ دوستی بھرے انداز میں ہنسا۔ "مجھے بس باتوں کا ہنر ہی آتا ہے۔"
وہ بھی ہنس پڑی۔
ڈاکٹر میز پر پڑا قلم اور رائٹنگ پیڈ اُٹھا کر کچھ لکھنے لگا، پھر بولا:
"مجھے بتایا گیا ہے کہ تم انگریزی سمجھ لیتی ہو اور بول بھی لیتی ہو۔ یہ پوچھنا بے جا ہوگا کہ تم انگریزی لکھ بھی لیتی ہو۔ میں نے تمھارے لیے ایک نسخہ تجویز کیا ہے، اسے غور سے پڑھ لینا۔ میں کل پھر آؤں گا۔"
اُسی وقت سسٹر فلورا اندر آگئی، ڈاکٹر اس کے ساتھ باتیں کرتا باہر نکل گیا۔
غُرفہ حسبِ معمول چت لیٹی رہی۔ کئی دنوں کی اس کیفیت نے اُسے مجسمہ بنا دیا تھا۔
پھر اُسے خیال آیا ڈاکٹر کہہ گیا ہے، میں نے نسخہ تجویز کر دیا ہے، اسے غور سے پڑھ لینا، کمال

ہے۔نسخہ استعمال کرنے کی چیز ہوتا ہے یا پڑھنے کی!

وہ چونکی۔ چہرہ میز کی طرف موڑا اور پھر نسخے والا کاغذ اُٹھالیا۔اس پر لکھا تھا:

''......میرے اس سوال کو کئی بار پڑھو جب سمجھ میں آجائے' جواب لکھتی جاؤ۔ترتیب اور تدوین کی ضرورت نہیں......''

''بات شروع کہاں سے ہوئی تھی؟''

☆☆☆

وہ ریڈیو سٹیشن سے اپنا سہ پہر کا پروگرام ختم کر کے باہر نکل رہی تھی۔گیٹ کے پاس ایک انتہائی وجیہہ وشکیل مرد کھڑا تھا۔ریڈیو سٹیشن کے اندر اور باہر شوقیہ فن کاروں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ایک چھوٹا سا پروگرام لینے کے لیے شائقین سارا سارا دن کھڑے رہتے، سُو سُو منتیں کرتے۔ جو بھی اندر سے نکلتا، پروڈیوسر سمجھ کر جھٹ سلام داغ دیتے مگر اس آدمی کی وضع قطع نے اسے رُکنے پر مجبور کردیا۔کار کے شیشے سے منہ باہر نکال کر پوچھا:

''کیا کام ہے آپ کو؟''

بولا:''کوئی کام نہیں ہے۔''

پوچھا:''یہاں یوں کھڑے ہو......؟''

بولا:''کسی کو دیکھنے آیا تھا۔''

وہ دل میں بولی''دیکھو پھر......'' اور موٹر کو نکال کر لے گئی۔

دوسرے دن ٹھیک اسی وقت جب وہ باہر نکلی تو وہ بھی اسی جگہ کھڑا تھا۔دیکھنے میں کتنا ڈیسنٹ تھا۔شاید آج پھر اِسی اُمید میں کھڑا ہوگیا ہو کہ وہ آج بھی اس کے آنے کا سبب دریافت کرے گی۔سو وہ بے نیازی بنی زن سے گزر گئی، گویا دیکھا ہی نہیں۔تیسرے دن بھی وہیں اسی انداز میں کھڑا تھا۔پھر کئی دن تک نظر نہیں آیا۔

ایک دو مہینے کے بعد پھر نظر آگیا...... گلے میں ایک قیمتی کیمرہ لٹکائے' آنکھوں پر کالے شیشوں کا چشمہ چڑھائے بالکل فلمی ہیرو کے انداز میں گیٹ کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔پتہ

نہیں کس پر رُعب ڈالنے کا ارادہ تھا!

وہ گزرنے لگی تو اُس نے اشارہ دے کر کار روک لی' وہ رُک گئی۔ آگے آ کر بولا: ''کیا مجھے لفٹ مل سکے گی؟''

''کہاں جانا ہے.....؟''

''بس مال روڈ تک......''

وہ پس و پیش میں مبتلا، سوچ رہی تھی۔ کسی اجنبی کو موٹر میں بٹھانے کے نتائج خوفناک بھی ہو سکتے ہیں۔ زمانہ ہی ایسا ہے۔ انہونیاں تو آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔ وہ مشکوک انداز میں اس کا جائزہ لینے لگی۔ کیمرے کے علاوہ اس کے پاس کچھ نہ تھا۔

اِس نے اُس کی اجازت کا انتظار ہی نہیں کیا' دوسری طرف سے دروازہ کھول کر خود ہی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کے موڈ کی پروا کیے بغیر بولا:

''وہ جو سڑک کے پار سرخ رنگ کی ٹیوٹا کرولا کھڑی ہے نا' وہ میری ہے۔ یہاں آ کے اچانک بند ہو گئی۔ مال روڈ کی ایک گلی میں میرا ورکشاپ ہے۔ میں وہاں سے مکینک لا کر اُسے ٹھیک کروالوں گا۔ بس مجھے آپ مال روڈ تک ڈراپ کر دیں۔'' ...... یہ کہہ کر اس نے ادھ کھلا دروازہ بند کیا اور ریلیکس ہو گیا۔ غُرفہ نے بغیر کچھ کہے گاڑی سٹارٹ کر دی۔ موٹر چلانے والی عورت کو بہادر اور نڈر ہونے کا تاثر تو دینا چاہیے...... بولی:

''کہاں سے آ رہے تھے؟''

''گوجرانوالہ سے۔'' وہ بولا۔

''اور گاڑی ریڈیو سٹیشن آ کر خراب ہوئی!''

ہنس پڑا...... ''آنا ہی ریڈیو سٹیشن تھا۔''

''پروگرام لینے کا شوق ہے؟''

''نہیں، کسی کو دیکھنے کا شوق ہے۔''

اب غُرفہ مصلحتاً چپ ہو گئی اور خاموشی سے موٹر چلاتی رہی۔ گویا اسے اس کے شوق سے

کوئی دلچسپی نہ تھی۔

وہ بھی تھوڑی دیر تو چپ رہا، پھر خود ہی بولنے لگا:

''پچھلے دو سالوں سے میں آپ کا پروگرام ''دُھوپ کی دستک'' سن رہا ہوں۔ میری پوسٹنگ گوجرانوالہ میں ہے۔ میرا دفتر بھی تین بجے آف ہوتا ہے۔ جونہی میں لاہور کے لیے روانہ ہوتا ہوں، ریڈیو آن کر لیتا ہوں۔ اسی وقت آپ کا پروگرام شروع ہو جاتا ہے۔ ابتدا میں' مَیں صرف سفر گزاری کے لیے آپ کا پروگرام سُنا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے آپ کی آواز نے مسحور کرنا شروع کر دیا۔ آپ کا پروگرام دلچسپ تر ہوتا گیا۔ آپ کا بولنے کا انداز۔ شخصیات کو متعارف کرانے کا منفرد سلیقہ اور مشاہیر سے انٹرویو کرنے کا نت نیا قرینہ...... سب کچھ مجھے متاثر کرنے لگا۔ یہ پروگرام مجھے نشے کی طرح لگ گیا۔ اس پروگرام کی وجہ سے میرا واپسی کا سفر ایسے کٹتا کہ مجھے اِحساس ہی نہ ہوتا بلکہ میں کوئی ہمسفر ساتھ بٹھانے سے کترانے لگا۔''

وہ خاموشی سے سڑک پر نظریں جمائے گاڑی چلاتی رہی۔

''اس پورے عرصہ میں' مَیں نے آپ کی آواز کی پھبن اور لہجے کے اوج میں کوئی فرق محسوس نہیں کیا۔ جوں جوں دن گزرتے، جی میں اُمنگ اُٹھتی کہ چل کر کر آواز کی ملکہ کو دیکھا جائے۔''

''موٹر خراب ہونے کا ڈھونگ رچانے کی کیا ضرورت تھی۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''نہیں نہیں، موٹر تو آج اتفاقیہ خراب ہوئی ہے۔ میں پہلے بھی کئی مرتبہ آپ کو دُور سے دیکھ کر جا چکا ہوں۔''

ایسے میں لڑکیاں عام طور پر پوچھتی ہیں...... پھر میں کیسی لگی۔ یا مجھے دیکھ کر مایوسی تو نہیں ہوئی...... یا میری آواز زیادہ اچھی لگی یا مَیں...... وغیرہ وغیرہ۔ غُرفہ اِن ہتھکنڈوں کو پسند نہیں کرتی تھی۔ اس لیے ٹس سے مَس نہ ہوئی۔

''آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ آپ کی آواز کیسی ہے......!'' شاید وہ جلدی جلدی سب کچھ اُگل دینا چاہتا تھا۔ ''عجیب غنائی اور تمنائی آواز ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے کوئی سوتے میں بول رہا

ہے اور جاگتے میں سن رہا ہے۔ میں نے ندی کی روانی کا محض محاورہ ہی سُنا تھا...... رکتی ہے، اچھلتی ہے، چلتی ہے، لہراتی ہے...... رُک رُک کے رواں ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے، آپ کی آواز سماعت کے پردے کو چھو کر سیدھی دل پر گر رہی ہے...... دل سے ٹکراتی ہے تو سارے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ جاتی ہے۔"

غُرفہ کی آواز میں ایک خاص بات تھی۔ سب سننے والے اس کی آواز کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے۔ روزانہ اسے مرد و زن کے سینکڑوں تعریفی خطوط موصول ہوتے تھے۔ ہر کوئی اپنی پسند کے مطابق اس کی تعریف کرتا تھا۔ مگر اس اجنبی کی تعریف کا انداز بہت نرالا اور حقیقت سے قریب تر تھا۔ غُرفہ کو اس کا یوں بے جھجک تعریف کرنا بہت اچھا لگا۔ مگر اُسے اس بات کا بھی احساس تھا کہ مرد سمجھتے ہیں، عورت کی تعریف کریں تو فوراً پگھل جاتی ہے۔ اس لیے اس نے بس اتنا ہی کہنے پر اکتفا کی ...... "شکریہ ......"

"پھر ایک دن دل بے اختیار چاہنے لگا کہ چل کر آپ کو دیکھوں۔"

"کیوں......؟" غُرفہ کے منہ سے نکل گیا۔

"دیکھنا چاہتا تھا، جن کی آواز ایسی جادو بھری ہوتی ہے، ان کی صورت کیسی ہوتی ہے؟"

اس بات کا جواب چاہنے کیلیے غُرفہ کا دل مچلنے لگا مگر اس نے ضبط کیا۔ وہ جان گئی تھی کہ اس نے اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے لیے یہ آخری پتہ پھینکا ہے۔ بڑی نرمی سے بولی:

"مال روڈ آ گئی ہے۔ آپ کہاں اُتریں گے؟"

وہ ہاتھ سے اشارہ کر کے بولا: "وہاں، اس گلی کے موڑ پر اُتار دیں۔ مجھے گلی کے پچھواڑے جانا ہے۔"

گلی کے موڑ پر جا کر غُرفہ نے کار روک لی اور بولی:

"میری آواز اور میرا پروگرام پسند کرنے کا بے حد شکریہ!"

وہ اُتر گیا۔ دروازہ بند کرنے سے پہلے بولا:

"قیامت کا یہ انداز آپ نے کہاں سے پایا، اتنا تو بتا دیں! ورثے میں ملا یا خود ساختہ

ہے؟''

وہ مسکرائی...... ''پتہ نہیں۔''

اس نے شائستگی سے دروازہ بند کردیا۔اور چہرہ اندر کر کے بولا:

''لفٹ دینے کا بے حد شکریہ...... ویسے آپ نے آج مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ ایسی آواز والی عورت کو اتنا ہی باوقار اور پُر اعتماد ہونا چاہیے تھا۔''

☆☆☆

غُرفہ کی آواز میں انوکھی تاثیر تھی۔ایسی آواز اُسے اپنی ماں اور نانی سے وراثت میں ملی تھی۔ غیر منقسم مشرقی پاکستان میں اس کی نانی جہاں آرا کا کلاسیکل موسیقی میں بڑا نام تھا۔اس کی نانی نے ایک پنجابی جاگیردار سے شادی کر لی تھی، جس میں سے ایک ہی بیٹی ہوئی...... مہرالنساء...... اپنی لاڈلی بیٹی کو اس نے موسیقی کی تربیت تو دی مگر شوہر کے خوف سے گانے کی اجازت نہ دی۔ جب ڈھاکہ میں پنجابیوں کے خلاف نفرت کی لہر اُٹھی، اس کے نانا نانی قتل ہو گئے' اور اُس کی ماں کسی طرح لاہور آ گئی۔لاہور میں آکر اُس نے ریڈیو میں ملازمت کر لی اور مجبوریوں کے موسم میں ریڈیو کے ایک سینئر پروڈیوسر سے شادی رچالی۔اس کی بھی ایک ہی بیٹی ہوئی یعنی ''غُرفہ''۔

مہرالنساء نے اپنی بیٹی غرفہ کو موسیقی کی باقاعدہ تعلیم نہیں دی تھی۔ وہ کہتی تھی گانے والی عورتوں کی قسمت اچھی نہیں ہوتی۔تعلیم کے اختتام پر غُرفہ نے بھی ریڈیو میں ملازمت کر لی کہ آواز کو سجانے اُور دُور دُور تک پہنچانے میں ریڈیو کا کوئی ثانی نہیں ہے۔آواز تو سحر انگیز تھی ہی مگر اُتار چڑھاؤ کا فن اس نے ریڈیو کی ملازمت میں رہ کر اپنایا تھا۔اُسے جو بھی پروگرام ملتا، اس کے ساتھ ہی پسندیدگی کی سند بھی مل جاتی۔خاص طور سے موٹر کے ذریعے سفر کرنے والے تو اُسے لاتعداد خطوط لکھتے تھے' اور ہر خط میں لکھا ہوتا کہ اِس پروگرام کی وجہ سے اُن کا سفر بہت خوبصورتی سے کٹ جاتا ہے۔اس لیے جب اجنبی اس کے رُوبرو اِس بات کا اعتراف کر رہا تھا تو اُسے نہ تو جھوٹ کا گمان ہوا اُور نہ ہی مبالغے کا...... نہ ہی اس شخص کا لہجہ خوشامدانہ تھا۔

ویسے بھی اس کے ساتھ بے نیازانہ رویہ اپنا کر اُسے بہت مزہ آیا تھا۔

یوں دیکھنے میں وہ ایک عام سی شکل کی لڑکی تھی۔ اس کا چہرہ بیضوی‘ رنگ سانولا سنہرا تھا۔ مگر آنکھیں...... اس کی آنکھیں بنگالی حسن کی آئینہ دار تھیں۔ یہ آنکھیں اور آواز کا لوچ اُس نے اپنی نانی سے لیا تھا۔ آواز کے ساتھ آنکھیں بھی اُس کی شناخت تھیں...... بڑی بڑی‘ سیاہ چمکیلی‘ گھنیری پلکوں کے سائبان...... ہمہ وقت جن پر سایہ رکھتے اور کہیں کہیں سرخ ڈورے بولتے نظر آتے۔

اس کے چہرے پر سارا اُجالا آنکھوں کا تھا۔

اور اُس کی آنکھوں میں سارا کیف، اس کی آواز کا تھا۔

اور اس کی آواز کی ساری کھنک سنہرے دیس کی ایک پرانی یاد تھی۔

☆☆☆

ایک دن وہ گھر گئی تو ماں نے بتایا کہ اس کے لیے بہت اچھا رشتہ آیا ہے۔

''ماں!''...... وہ بولی: ''پچھلے پانچ سالوں میں جتنے بھی رشتے آئے تھے، سارے ہی تمھیں بہت اچھے دکھائی دیئے تھے۔''

''ہاں''...... ماں بولی: ''جو چل کر آتے ہیں، ان کو اچھا ہی کہنا پڑتا ہے۔ مگر آج جو شخص بات کرنے کے لیے آیا تھا، بڑا معزز اور خاندانی لگتا تھا۔''

''کس کی بات کرنے آیا تھا؟''

''اپنے بھتیجے کی۔''

''کیا کرتا ہے اس کا بھتیجا؟''

''میں نے تفصیل سے تو پوچھا نہیں، کوئی سرکاری ملازمت کرتا ہے۔ مگر اس کا چچا یہاں سول سیکرٹریٹ میں سیکرٹری اوقاف لگا ہوا ہے۔ بڑا ہی بھلے مانس دکھتا تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ بیٹی کی مرضی پر منحصر ہے۔ وہ تم سے ملنے کل شام کو دوبارہ آئے گا۔''

''ماں...... تم مجھ سے پوچھے بغیر ہی ملنے کا وقت دے دیتی ہو۔''

''بیٹی! اب چکر لگوانے کا زمانہ نہیں ہے۔ نہ کسی کے پاس اتنا وقت ہوتا ہے۔ میں نے کہہ دیا تھا وہ اپنے بھتیجے کو ساتھ لے کر آ جائے۔ تم دیکھ لو' پسند نہ آئے تو روک دیں گے۔''

یہ مائیں بھی کتنی پریکٹیکل ہوتی جا رہی ہیں۔ وہ بڑبڑانے لگی۔

دوسرے دن ریڈیو سے اپنا پروگرام ختم کر کے باہر نکلی تو ایک بیکری کے آگے رُک کر کچھ کھانے کا سامان خریدا۔ گھر میں داخل ہوئی تو ڈرائنگ رُوم سے آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ پہلے باورچی خانے میں چلی گئی۔ چائے بنائی۔ ٹرالی پہ سب مٹھائیاں سجائیں۔ نوکرانی کے ہاتھ اندر بھیج دیں۔ پھر منہ ہاتھ دھو کر بال درست کیے' میک اَپ کا اُسے شوق نہیں تھا۔ یہ اسے معلوم تھا، اُس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی جاذبیت ہے۔ جس دن یہ جاذبیت کسی کے دل میں جاگزیں ہوئی، بات خود بخود بن جائے گی۔ کپڑوں کی سلوٹیں ہاتھ سے درست کرتی' ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

اندر داخل ہوئی تو دونوں کھڑے ہو گئے۔ اس نے سلام کرتے ہی دوسرے آدمی کو حیرت سے دیکھا۔

''آج پھر صورت کا آواز سے موازنہ کرنے آ گئے؟''

وہ ہنس دیا، شرمیلی سی ہنسی۔

''حامد علی میرے چچا ہیں، ان کو گواہی کے لیے لایا ہوں۔'' وہ چائے بنا کر دینے لگی اور حامد علی اس کا مفصل تعارف کروانے لگے۔

اس کا نام غفران علی تھا۔ ایک بڑی اچھی سرکاری پوسٹ پر تھا۔ آج کل گوجرانوالہ میں تعینات تھا۔ اس کے بڑے چچا چیف سیکرٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ بات بڑھی تو ان کا خاندان لاہور کے انتہائی محترم خاندانوں میں سے نکلا۔ اعتراض کی گنجائش ہی نہ نکلی، سوائے اس کے کہ غُرفہ اس وقت ۲۸ برس کی تھی اور وہ تیس برس کا تھا۔ غُرفہ کا خیال تھا کہ فرق کم از کم پانچ سال کا ہو۔

مگر وہ کہتا تھا، برابر کی عمر میں انڈرسٹینڈنگ بہت جلدی ہو جاتی ہے۔ اور پھر آج کل

برابر کی عمر میں شادی کرنے کا رُجحان بڑھ رہا ہے۔

ایک دن غُرفہ نے پوچھا: ''اس دن آپ نے اپنا نام کیوں نہیں بتایا تھا؟''

''بتانا چاہتا تھا مگر اس روز تم اتنا رعب دکھا رہی تھیں کہ میں مرعوب سا ہو گیا۔''

''رُعب نہ دکھاتی تو آپ یہاں تک آتے!''

''تب بھی آتا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا، اسی لڑکی سے شادی کروں گا۔''

''میں نے غفران نام پہلے کبھی سنا نہیں۔''

''میں نے بھی تو غُرفہ پہلی مرتبہ سُنا ہے۔ اور مجھے یوں لگا جیسے یہ میرے نام ہی کا ایک حصہ ہے۔''

''آپ مرد لوگ اتنی جلد اتنا آگے سوچ لیتے ہو۔''

''اگر آپ لوگوں کی طرح فیصلہ کرنے میں اتنی دیر لگائیں، پھر تو ہم مرد ہی نہ ہوئے نا؟''

غُرفہ نے صرف ایک ہی شرط رکھی کہ وہ شادی کے بعد بھی ریڈیو کی ملازمت جاری رکھے گی، اسے کسی صورت چھوڑنے پر مجبور نہ کیا جائے!

اور غفران نے بھی صاف کہہ دیا تھا کہ اسے بھی اس کی آواز سے عشق ہے۔ غُرفہ کو بھی ساری عمر یہ آواز اسی طرح سنبھال کر رکھنا ہوگی...... اس کی خاطر!

دونوں جانب سے ہر طرح کی تسلی ہوگئی تو ان کی شادی بڑی سادگی سے ہوگئی۔

☆☆☆

شادی کے فوراً بعد جو فرق پڑا وہ یہی کہ غفران کی ٹرانسفر لاہور ہوگئی۔ ٹرانسفر ہی نہیں بلکہ اس کی پروموشن محکمہ سیاحت میں ہوگئی۔ اُنھیں ایک خوبصورت سا سرکاری بنگلہ مل گیا تھا۔ وہ ہمیشہ اعتراف کرتا کہ اس کی زندگی میں غُرفہ کا قدم مبارک ثابت ہوا ہے۔ سال بعد بیٹا پیدا ہو گیا۔ جبران کی آمد نے ان کی محبت کی تکمیل کر دی۔

جب تک غفران کی ٹرانسفر نہیں ہوئی تھی، وہ دونوں ماں کے پاس رہتے تھے۔ اپنا گھر ملتے ہی غُرفہ نے ماں کا گھر چھوڑ دیا۔ دونوں نے ماں کو بہتیرا سمجھایا کہ وہ اپنا ذاتی گھر کرائے پر

دے کران کے ساتھ رہے مگر ماں نے صاف انکار کر دیا۔ بولی: ''میں اپنی زندگی کے آخری دن اسی گھر میں گزارنا چاہتی ہوں جو میرے شوہر نے بڑے ارمانوں سے مجھے بنا کر دیا تھا۔'' غُرفہ نے اپنے باپ کا راج نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے اپنے شوہر کے سٹیٹس کو انجوائے کرنا چاہتی تھی۔ وہ تو پہلے سے ہی شہرت کا مزہ چکھ چکی تھی۔ مگر اب اپنے شوہر کے حوالے سے محفلوں میں جانا اسے بہت اچھا لگنے لگا تھا۔ ہاں غفران اکثر مستی میں آکر کہتا: ''اب دفتر آنے جانے میں مزہ نہیں آتا۔ تمھاری آواز ہمسفر نہیں ہوتی۔''

وہ ہمیشہ کہتی...... ''ہم دونوں میں سے ایک کی ہمسفری پر قناعت کرلو۔''

یوں بھی غُرفہ کو گھر میں بہت کم بولنے کی عادت تھی۔

زندگی کا معمول کچھ ایسا بن گیا کہ غُرفہ دِن کے وقت گھر کا سارا کام ختم کر کے بارہ ایک بجے سٹوڈیو جاتی کیونکہ اِس کا پروگرام تو تین بجے شروع ہوتا تھا۔ جاتے وقت وہ جبران کو تیار کر کے ماں کے پاس چھوڑ دیتی کیونکہ ماں کا گھر راستے میں پڑتا تھا۔ اور ماں کی بھی یہی خواہش ہوتی تھی کہ دن کا سارا وقت وہ اپنے نواسے کے ساتھ گزارے۔

غُرفہ اپنی عادت کے مطابق صبح کے سارے کام خوش اسلوبی سے نمٹا کر ہی جاتی تھی کچھ دِنوں سے وہ محسوس کر رہی تھی، کہ غفران دفتر جانے سے پہلے اپنی الماری میں لٹکے ہوئے سارے کپڑے نکال کر قالین پر ڈھیر کر دیتا ہے۔ اصولاً اُسے روزانہ ایک پینٹ اور ایک قمیض ہی درکار ہوتی تھی۔ ہر روز غُرفہ ڈھیر کی صورت میں بکھرے ہوئے کپڑوں کو دوبارہ ہینگروں پر لٹکاتی اور تہہ جما کر رکھتی۔ اس میں پورا ایک گھنٹہ صرف ہو جاتا تھا۔ دو چار دن تو وہ اسے اتفاق یا عجلت ہی سمجھتی رہی...... جب دس بارہ دن تک یہی عمل دُہرایا جاتا رہا تو تنگ آ گئی۔ ایک دن تھکی ہاری بولی:

''غفران کچھ تو خدا کا خوف کیا کرو۔ روزانہ ہی سارے کپڑے الماری سے نکال کر قالین پر ڈھیر کر جاتے ہو۔ میں انہیں دوبارہ تہہ لگاتے لگاتے اور لٹکاتے لٹکاتے تھک جاتی ہوں۔ کچن کا کام کرنا ہوتا ہے۔ جبران کو تیار کر کے ماں کے ہاں چھوڑنا ہوتا ہے۔ پھر سٹوڈیو جا

کر پروگرام کی تیاری کرنا ہوتی ہے۔ میں تھک کر جاؤں تو پروگرام ٹھیک سے نہیں ہوتا۔''

''بیگم صاحبہ، میں سمجھ گیا ہوں کہ ہنی مون کا زمانہ گزر گیا ہے۔'' وہ طنز سے بولا۔

''یہ کیا تک ہے بھئی۔ ایک قمیض اور پینٹ نکالنے کے لیے تمھیں ساری الماری منتشر کرنا پڑتی ہے۔ مجھے آواز دے لیا کرو۔ میں آکر نکال دیا کروں گی۔''

''میں تو اسی طرح کپڑے نکالنے کا عادی ہوں۔ تمھارے پاس کپڑے لٹکانے کا وقت نہیں تو نہ لٹکایا کرو۔ میں دفتر سے واپس آکر خود الماری ٹھیک کر لیا کروں گا۔''

''وہ تنک کر بولا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس روز وہ الماری درست کیے بنا ہی سٹوڈیو چلی گئی۔

اُس روز سٹوڈیو میں کچھ دیر بھی زیادہ ہوگئی تھی۔ وہ جب ماں کے گھر سے جبران کو لے کر لوٹی تو غفران آچکا تھا۔ چائے بنا کر اس کے کمرے میں لے گئی۔ وہ مُنہ پھلائے بیٹھا تھا اور کپڑوں کا ڈھیر الماری کے آگے پڑا تھا۔

''تم تو کہتے تھے میں خود الماری ٹھیک کر لوں گا۔'' غُرفہ نے ہنس کر دوستانہ ادا سے کہا...... ''مگر اب پتہ چل گیا ہے کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔''

پھر خود ہی کپڑے اُٹھا کر الماری میں لٹکانے لگی۔

وہ تلخی سے بولا: ''کپڑے لٹکانا اتنا مشکل کام نہیں ہے۔ اب پتہ چلا ہے کہ کام کرنے والی عورت کے ساتھ نباہ کرنا بڑا مشکل ہے۔''

''اچھا جی!'' وہ تھکے تھکے انداز میں بولی: ''مگر تمھیں تو یہ سب قبول تھا۔''

''کیا پتہ تھا، ساری زندگی آواز کے بل بوتے پر تو نہیں گزر سکتی۔'' وہ تنا تنا سا بیٹھا رہا۔

غُرفہ چُپ کر گئی۔ اسے بات بڑھانے کی عادت ہی نہیں تھی۔ کمرے سے باہر نکل گئی اور کچن میں جا کر رات کا کھانا بنانے لگی۔

اس رات دونوں کھنچے کھنچے سے رہے۔

اگلی صبح وہ تیار ہو کر اس کے کمرے میں گئی۔ وہ دفتر جا چکا تھا اور حسبِ معمول قالین پر

کپڑوں کا ڈھیر پڑا تھا۔

اچھا تو وہ مجھے اپنی زر خرید نوکرانی سمجھتا ہے۔

اس نے بھی کپڑے نہیں اُٹھائے۔ اس رات ان کی باقاعدہ پہلی لڑائی ہوئی۔ وہ ہر آئے گئے سے کہنے لگا' بیگم صاحبہ کو میرا کام کرنے سے گھن آتی ہے۔ اَور وہ لوگوں کو سمجھا سمجھا کر تھک گئی کہ وہ اِسے تنگ کرنے کے لیے سارا کمرہ تہہ و بالا کر دیتا ہے۔

''میں اس کا ہر کام اپنے ہاتھ سے کرنے کو تیار ہوں۔ وہ مجھے پہلے سے بتا دیا کرے۔''

یہ لڑائی ایک مہینہ چلی......

ایک مہینہ تک غفران نے اس سے بات تک نہیں کی۔ رات کو دوستوں کے ہاں جانے لگا۔ وہ بہت پریشان ہوگئی......اُداس ہوگئی......

پروگرام کے دوران اس کا لہجہ ٹوٹنے لگا۔ اس کی بات میں تسلسل نہ رہا۔ لوگوں کے خط آنے لگے کہ اب اس کی آواز سے کھنکتے سکے نہیں گرتے۔ وہ خوفزدہ ہوگئی۔ اس نے خود آگے بڑھ کر صلح کر لی' اس کی ہر بات مان لی۔

کیسے ممکن ہے کہ دو افراد گھر میں رہتے ہوں اور ایک دوسرے سے بات نہ کریں۔ یہ اسے کسی قیمت پر بھی گوارا نہیں تھا۔

☆☆☆

لکھتے لکھتے غُرفہ نے سر اُٹھایا۔ یوں لگا جیسے وہ ایک لمبی مسافت طے کر کے آئی ہے۔ اب تھک گئی ہے، ہانپ رہی ہے، بیدم ہوگئی ہے۔

خوبصورت یادیں ویرانوں میں جا بستی ہیں۔ اُنھیں پکارتے پکارتے بھی آدمی مضمحل ہو جاتا ہے۔ گزرا ہوا وقت پرانے گیتوں کی طرح اُداس کر دیتا ہے۔ ہمیشہ یاد کے پلو میں کسی کانٹے کی گرہ لگی ہوتی ہے......

ماضی کا کنول درد کی جھیل میں کھڑا رہتا ہے......ہرا رہتا ہے۔

☆☆☆

اگلے دس برس سمجھوتے کی گاڑی پر بیٹھ کر بسر ہونے لگے۔

اس نے دیوار کے ساتھ سر ٹکا کر ایک سرد آہ کھینچی ......

ماں بھی تو یہی کہتی تھی کہ شادی کی ناکامی کا الزام ہمیشہ کام کرنے والی عورت پر آتا ہے۔ اور پھر گانے والی کی بیٹی تو خواہ مخواہ نشانہ بن جاتی ہے۔ ماں تو یہ بھی کہتی تھی کہ نوکری چھوڑ دو، جس طرح تمھارا شوہر چاہتا ہے اسی طرح کرو۔

مگر وہ ریڈیو چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھی۔ اسی ربط سے تو اس کی سانس چل رہی تھی۔ جیتے جی وہ اپنے آپ کو مار نہیں سکتی تھی۔ اسی ملازمت کی خاطر لچکیلی ڈال کر طرح جھکتی چلی گئی۔ اس کی اسی مجبوری کا استحصال غفران کرتا چلا گیا۔

اُس کے ارادے کی پختگی دیکھ کر رفتہ رفتہ وہ ریڈیو سٹیشن آنے لگا۔ اس کے پروگرام میں مشورے دینے لگا۔ اس کے کمرے میں بیٹھا رہتا۔ آئے گئے سے گپ شپ کرتا رہتا۔ اُس کی ڈاک کھول لیتا۔ اس کے کاموں میں دخیل ہوتا۔ مگر وہ دل پر جبر کرتی رہتی۔ جو بات عُرفہ کو سب سے زیادہ بُری لگی وہ یہ تھی کہ وہ ڈرامے میں حصہ لینے والی معمولی معمولی لڑکیوں کو بہت اہمیت دینے لگ گیا۔ ان کی سفارشیں لے کر آجاتا۔ اور کبھی کبھی انھیں اپنی موٹر پر بٹھا کر گھر تک بھی لے جاتا۔

ایسے موقعوں پر چھوٹی موٹی جھڑپیں زندگی کا معمول بن گئیں۔ مگر وہ انھیں جھگڑا نہیں بننے دیتی تھی۔ کیونکہ غفران کے اذیت دینے کا انداز ایک ہی تھا۔ رُوٹھ جاتا۔ اور مہینوں اس کے ساتھ بات نہ کرتا۔ سارے سلسلے بند ہو جاتے۔ کھانا بھی باہر کھانے لگ جاتا۔ تب اسے اپنے بجے سجائے گھر سے وحشت ہونے لگتی۔ ہمیشہ اسے ہی جھکنا پڑتا۔ کیونکہ وہ زبان کے سناٹے سے اکتا جاتی تھی۔ اُس روز تو وہ اس قدر پریشان ہوئی، جب غفران نے اسے بتایا کہ وہ بھی ریڈیو کے ایک ڈرامے میں کام کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ اس کی عدم موجودگی میں وہ اپنی آواز کا آڈیشن بھی دے چکا تھا اور سب لوگوں نے خوشامدانہ انداز میں اسے باور کرایا تھا کہ ریڈیو کے لیے اس کی آواز انتہائی موزوں ہے۔

''دیکھو غفران، تم ایک سرکاری ملازم ہو! اور ڈراموں میں کام کرنا تمھارے سٹیٹس کے خلاف ہے۔''

''کیا ہے میرا اسٹیٹس؟'' وہ غصے میں کہتا۔ ''تمھیں تو سٹیٹس فوبیا ہو گیا ہے۔''

''سمجھنے کی کوشش کرو غفران۔ تم اس وقت ایک اچھی پوسٹ پر ہو۔ سب لوگ جب سفارشوں کے لیے تمھارے پاس آتے ہیں تو میں فخر محسوس کرتی ہوں۔ چہ جائیکہ تم خود ڈرامے مانگتے پھرو۔''

''کیا تم سمجھتی ہو، ڈرامے میں کام کرنے کے لیے مجھے تمھاری سفارش کی ضرورت ہوگی؟'' وہ چلا کر کہتا۔ ''تمھارے جیسی عورتوں کو میں نوکریاں دے سکتا ہوں۔''

''ہاں تم نوکریاں دے سکتے ہوں'' وہ نرم پڑ جاتی۔ ''اپنے شعبے تک رہو نا! میرے شعبے میں کیوں گھس رہے ہو؟''

''واہ واہ! خود پسندی کی انتہا دیکھو۔ ایک معمولی سی پروڈیوسر بن کے سارے شعبے پر قبضہ کر بیٹھی۔ تمھارے جیسی عورتیں وہاں ہر روز جوتے چٹخاتی نظر آتی ہیں۔''

''یہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں' ہمارے جیسے سائلوں میں کیوں شامل ہونا چاہتے ہو! یہ حقیر کام ہم جیسے لوگوں کے لیے چھوڑ دو۔''

''شٹ اَپ تنگ نظر عورت!'' جب اسے کوئی دلیل نہ سوجھتی تو ہمیشہ گالی گلوچ سے اسے چپ کرا دیتا۔

غزنہ نے یہ مسئلہ اپنی ماں کے آگے رکھا:

''ماں! وہ میرا مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ آواز کی دُنیا میں داخل ہونا چاہتا ہے۔''

''بیٹی! جو تمھارا مقام ہے وہ تمھارا ہی رہے گا۔ ذرا سا اُس کا شوق ہے۔ چند ڈراموں میں کام کرے گا تو شوق کی یہ آندھی اُتر جائے گی۔ تم زیادہ مخالفت نہ کرو۔ تم مرد کی فطرت کو نہیں جانتیں۔ جس بات سے اسے منع کرو' ضد میں آ کر وہی کرتا ہے۔''

''مگر ماں'' وہ بڑا افسر ہے۔ میڈیا والے اس کا احترام کرتے ہیں۔ اگر اس شوق میں

اس کی نوکری چلی گئی تو......؟''

''وہ خودساری اُونچ نیچ کو سمجھتا ہے۔ وہ اپنی نوکری کی قیمت پر اپنا شوق پورا نہیں کرے گا۔ اس بات کو اب تم اور نہ بڑھاؤ!''

یہاں بھی غُرفہ کو ہار ماننا پڑی۔ بلکہ غفران کے لیے خصوصی سکرپٹ لکھوانے پڑے۔ وہ شوبز میں کیا داخل ہوا جیسے اس کے اندر، اور آگے جانے کی آگ بھڑک اُٹھی۔ زیادہ وقت ڈراموں میں گزارنے لگا۔ تو غُرفہ نے احتیاطاً یاد دلایا کہ وہ دفتری کاموں سے لاپرواہوتا جا رہا ہے۔

بولا...... ''یہ سرکاری نوکری بھی بڑی مصیبت ہے۔''

''آج کل اتنی اچھی نوکریاں کہاں ملتی ہیں؟''...... غُرفہ نے نرمی سے سمجھایا۔

''کیا ہے ان اچھی نوکریوں میں؟ محض ایک شان! کیا اس تنخواہ میں شریفانہ گزارا ہوتا ہے؟''

''مگر ہمارا تو اچھا گزارا ہو رہا ہے۔''

''ابھی ایک بچہ ہے نا، اس لیے! اگر تمھاری تنخواہ نہ ہو تو ہم کیا کریں؟''

''تمھارا گریڈ اور بڑھے گا نا!''

''گولی مارو اس گریڈ کو! میں تو سوچ رہا ہوں، سرکاری ملازمت چھوڑ دوں!''

''پھر کیا کرو گے؟ ڈراموں سے کیا ملتا ہے......؟''

''پرائیویٹ پروڈکشن کا کام شروع کر دوں گا۔ میرے کچھ دوستوں نے نوکریاں چھوڑ کر ٹی وی پروڈکشن کا کام شروع کر دیا ہے اور فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔''

''اس کام کے لیے بہت سرمایے کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''اچھا اب اپنی منفی سوچ کا اظہار نہ کرنا کیونکہ تمھیں تصویر کا تاریک رُخ دکھانے کا ہنر خوب آتا ہے۔ شاید تمھاری تربیت غیر یقینی حالات میں ہوئی ہے۔ اس لیے تم اذیت پرست ہو گئی ہو۔''

غُرفہ چپ تو ہوگئی مگر بے سکون بھی ہوگئی۔

وہی ہوا۔ غفران نے دفتر سے غیر معینہ مدت تک کی رخصت لے لی۔ اور شوبز کے کچھ دوستوں کو ساتھ ملا کے پرائیویٹ پروڈکشن کمپنی بنا کے کام شروع کر دیا۔ گھر میں اور قسم کے لوگوں کا آنا جانا شروع ہوگیا۔ صبح و شام ٹکراؤ ہونے لگے۔ گھر کا سکون غارت ہونے لگا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی چخ چخ ہو جاتی۔ صبر کا حوصلہ کرنے کے باوجود وہ رونے بیٹھ جاتی۔ اُسے مستقل زکام رہنے لگ گیا۔ گلے میں خراش ہوتی رہتی۔ کبھی کبھی جب وہ بہت پریشان ہوتی تو اس کی آواز بیٹھ جاتی۔ ڈاکٹر اُسے نہ بولنے کا مشورہ دیتے۔ اُس کے پروگرام کو جیسے کسی کی "نظر" لگ گئی تھی۔ اُس کے چاہنے والے بے تاب ہو کر اُسے خط لکھتے کہ اس کی آواز کو کیا ہوتا جا رہا ہے!

ایک آواز ہی تو تھی اس کی میراث......

ماں اُن دنوں بہت بیمار تھی۔ مگر اُس کے چہرے پر بے سکونی اور اضطراب کی شکنیں پڑھ سکتی تھی۔ اُس کو مسلسل کھانستا ہوا دیکھتی تو جڑی بوٹیوں کے نسخے تجویز کرتی۔

مرنے سے ایک دن پہلے، اسے قریب بلایا اور بڑے پیار سے کہنے لگی: "غُرفہ بیٹی تمھاری جائیداد تمھاری آواز ہے اس کی حفاظت کیا کرو!"

"کیسے کروں ماں......؟"

"میری بات غور سے سنو! قدرت کی طرف سے اچھا ذہن، اچھی آواز، اچھا قلم اور اچھی تحریر تحفے کے طور پر ملتے ہیں۔ مگر ان کی قیمت ساری زندگی چکانا پڑتی ہے۔ تم ابھی ناتجربہ کار ہو بیٹی! قدرت کے انعام زندگی کی انمول خوشیاں مانگا کرتے ہیں۔ ان کا تاوان دینا پڑتا ہے۔ ورنہ یہ انعام رُوٹھ جاتے ہیں۔ اگر تم چاہتی ہو، تمھاری آواز ہمیشہ سلامت رہے تو اپنے دل کی آرزوؤں کو بھینٹ چڑھا دو۔ آواز کو قائم رکھو...... گھر سنبھالو...... جو کچھ غفران بننا چاہتا ہے اسے بننے دو۔ مسکرا کر اس پل صراط سے گزر جاؤ۔ دل کا درد آواز میں سمولو...... عورت کی زندگی کا مقصد شادی کو قائم رکھنا ہے۔ بہت کم مرد اِس معیار پر پورا اُترتے ہیں...... مگر عورتیں اپنے قول

پر قائم رہتی ہیں۔ دُنیا میں کچھ بھی تمھاری مرضی کے مطابق ہونے کا نہیں......اور تو اور، بعض اوقات تمھاری اولاد بھی تمھاری مرضی کے مطابق نہیں ہوتی۔''

''ماں! اگر زندگی ایسی تھی تو پھر تو نے میری شادی کیوں کی تھی؟''......وہ رو دی۔

''بیٹی! زندگی ہر ایک کے ساتھ ایک جیسی ہوتی ہے۔ انسان کو دُنیا میں بھیجا گیا کہ وہ زندگی کو سمجھ کے اِس کے ساتھ چلے۔ مگر اِنسان دُنیا میں آتے ہی زندگی کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے لگا۔ تم زندگی کے تابع ہو، زندگی تمھاری غلام نہیں۔ زندگی کا عمل جراحی دیکھنے کے لیے شادی کرنا بہت ضروری ہے۔ میں سمجھتی ہوں، ناکام شادی شدہ زندگی' غیر شادی شدہ زندگی سے بدرجہا بہتر ہوتی ہے۔ اور پھر بڑھاپا!......شوہر کی رفاقت اور بچے کے بغیر اپاہج ہو جاتا ہے...... یہ میرا اپنا تجربہ ہے۔ جوانی تو ایک دوسرے پر چیخ چلّا کے گزر جاتی ہے۔ بڑھاپا بنا سہارے کے نہیں گزرتا۔ تمھارے ابو کے بعد مَیں ٹوٹ گئی تھی' بکھر جاتی اگر تمھارا سہارا نہ ہوتا۔''

ماں! بڑھاپا کس نے دیکھا ہے؟'' وہ جل کر بولی۔

''وقت گزرتے تمھیں پتہ بھی نہ چلے گا۔'' ماں نے دم لیا، سانس درست کیا۔ پھر کہنے لگی...... ''تم ایک بچہ اَور پیدا کر لو' خود کو اَور مصروف کر لو! ریڈیو کا کام چھوڑ نہیں سکتیں تو محدود کر لو' جبران بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ اپنے وجود کو بچوں میں کھپا دو۔ عورت کتنی مشہور کیوں نہ ہو جائے، اس کی شناخت بچے ہی ہوتے ہیں۔ دل کو رنجشوں سے پاک کرو، دل بڑا کرو، جوگن بن جاؤ...... جوگن بن کے اپنی آواز بچا لو......!''

غُرفہ کو ماں کی باتیں سمجھ میں آ رہی تھیں' مگر اس کا ضدی دل یہ باتیں ماننے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔

ماں فوت ہو گئی۔ تو روشنی دکھانے والا بھی کوئی نہ رہا۔

پھر ہوا یوں کہ غفران نے اس سے مشورہ کیے بغیر نوکری چھوڑ دی۔ وہ ایک عجیب جنونی آدمی نکلا۔ ہر جگہ اپنی بیوی کا نام استعمال کر لیتا۔ اس کی شہرت کو کیش کرا لیتا۔ مگر گھر کے اندر اسے آزار پہنچانے کا کوئی موقع جانے نہ دیتا۔ ایک دن تو صاف کہنے لگا:

"شوبز میں میرا نام بولنے لگا ہے۔ میرا سیریل لوگوں نے پسند کیا ہے۔ تم شہرت پر صرف اپنی اجارہ داری سمجھتی تھیں۔ اب مجھ سے جلنے لگی ہو!"

پھر بھی زندگی سرپٹ دوڑی چلی جا رہی تھی۔ ماں نے کہا تھا نا، شادی کو بچا کے رکھنا۔ شادی اس کی آواز مانگتی تھی۔ اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی۔ آواز سے محروم ہوتی جا رہی تھی۔

جبران پندرہ سال کا ہو گیا۔ گھر کے ماحول سے بیزار رہنے لگا۔ روز کہتا: "ماں مجھے امریکا بھجوا دو۔" اور وہ بھی وعدہ کرتی رہتی کہ "تم اچھے نمبروں میں اے لیول کر لو، پھر تمھیں بھجوا دوں گی۔"

سرکاری گھر کے جاتے ہی وہ لوگ ماں والے گھر میں شفٹ ہو گئے۔ غفران اپنا سارا سرمایہ اپنے کاروبار پر لگا رہا تھا۔ اب گھریلو اخراجات کے لیے بھی پیسے نہیں دیتا تھا۔ پھر بھی ایک روز برسبیلِ تذکرہ عُرفہ نے پوچھا......

"تم نے گوجرانوالہ کی اپنی حویلی بیچ دی اور مجھے بتایا تک نہیں۔"

"کیا تمھارے باپ کی تھی؟ میری تھی، میں نے بیچ دی۔"

"اس میں میرے باپ کا ذکر کہاں سے آ گیا؟" وہ روہانسی ہو گئی۔ "میں نے سوال کیا ہے، میرا نام لو تمھارا قصور نہیں ہے۔ تم ایسی صحبت میں رہنے لگے ہو کہ تمھارے طرزِ تکلم سے شائستگی رخصت ہو گئی ہے!"

"ہاں ہاں" ...... وہ تن کر بولا ...... "شائستگی تو ساری تمھاری ماں نے تمھیں گھول کر پلا دی تھی۔ تبھی تو تمھاری آواز میں رس تھا۔"

عُرفہ بات بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ نرمی سے بولی:

"تم شوہر لوگ جھٹ بیوی کے ماں باپ کو بیچ میں کیوں لے آتے ہو! کیا لڑائی جھگڑے میں کبھی میں نے تمھارے ماں باپ کا نام لیا ہے؟"

"تم تو اس لیے ایسا نہیں کرتیں کہ تمھارے ماں باپ......" پھر وہ خاموش ہو گیا۔

"ہاں ہاں! کہہ دو کہ تمھارے ماں باپ شریف نہیں تھے۔ کنجر تھے، میراثی تھے، گویے

تھے۔'' غُرفہ رونے لگی۔

''اب جب تم خود ہی اعتراف کر رہی ہو تو میں کیا کہوں؟''

''پھر میرے عشق میں مبتلا ہو کر مجھ سے شادی کیوں کی تھی؟''

''کرلی، ایک بار جھک مارلیا۔ اب کب تک اس شادی کی قیمت ادا کرتا رہوں گا۔

''چھٹکارا پالو!'' غُرفہ نے جل کر کہا۔

''تم ہی مہربانی کردو۔ کیونکہ تمھاری کائیاں ماں نے اتنا زیادہ حق مہر لکھوالیا تھا۔''

''ٹھیک ہے، میں حق مہر معاف کردوں گی۔ دے دو مجھے طلاق!''

''طلاق طلاق کیا لگا رکھی ہے؟ جب بیوی دل سے اُتر جاتی ہے تو سمجھ لو اسے طلاق ہو گئی۔ اب تم بے غیرت بن کر لٹکی رہو تو میں کیا کروں؟''

''بیوی دل سے اُتر جانے کی وجہ تو دریافت کرسکتی ہے نا؟''

''اپنی شکل دیکھو آئینے میں!''

''یہ وہی تو شکل ہے، جس پر تم مرمٹے تھے۔''

''اُلو کی پٹھی! باقی زندگی انہی باتوں کو یاد کر کے گزار لو۔ گھر میں گھستے ہی تمھاری منحوس صورت نظر آتی ہے۔ گھر آنے کو جی نہیں چاہتا۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

اس کا مطلب تھا، اب گھر میں سناٹوں کا ایک غیر یقینی سا موسم شروع ہو جائے گا۔ وہ دیر سویر گھر آئے گا۔ بات نہیں کرے گا۔ منہ مُنلا کے باہر نکل جائے گا۔ دونوں الگ الگ بستروں پر سوئیں گے۔ اس کے مہمان آئیں گے تو وہ سلام نہیں کرے گا۔ بات نہیں کرے گا۔ ان کو بدتمیزی سے نظر انداز کرے گا۔ گھر ویرانہ بن جائے گا۔ ویرانوں میں رُوحیں بسیرا کرلیتی ہیں، جیتے جاگتے جسم نہیں! اور اِس صورت حال میں جبرانؔ کتنا اُلجھ جائے گا۔ باپ کے پاس جائے گا، وہ ڈانٹے گا۔ ماں کے پاس آئے گا۔ وہ جھڑک دے گی......!

لکھتے لکھتے وہ کبیدہ خاطر ہو گئی۔ یادیں تو بھربھری ریت کی طرح اس کے حافظے سے پھسل پھسل کر نکلنے لگیں۔ وہ کتنی اُداس ہوئی یہ سوچ کر کہ اِس کے ذہن نے ہر تلخ بات کو

سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ لکھنے سے گزرے ہوئے لمحوں کی وہ دھندلی تصویریں صاف نظر آنے لگی تھیں...... جوں جوں وہ لاشعور کے جالے جھاڑتی جا رہی تھی، یادداشت روشن ہوتی جا رہی تھی، قطار اندر قطار واقعات اپنا سر اُٹھا رہے تھے۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ جوں جوں وہ ہر واقعہ لکھ رہی تھی، توں توں وہ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرتی جا رہی تھی۔ پھر بھی گزرے لمحوں کی کسک نے اُسے تھکا دیا، بیدم کر دیا۔

اس نے بستر پر لیٹ کر تھوڑا سا آرام کیا۔ آنکھیں بند کر لیں اور سانس کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

ایک وقت آیا جب غفران کا سکینڈل شوبز کی ایک عورت کے ساتھ چل نکلا۔ اُس کی خواہش پر غفران نے اپنی باقیماندہ جائیداد بھی بیچ دی۔ اور بڑے بجٹ کی فلم بنانے کا اعلان کر دیا۔

دل آرا اس فلم کی ہیروئن تھی اور غفران کا نام ہیرو کے طور پر آ رہا تھا۔ گو غفران کی عمر ہیرو بننے کی نہیں تھی مگر وہ اب بھی بڑا سمارٹ اور شاندار تھا۔ غُزنہ نے بڑے پیار سے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ یہی کہتا رہا کہ وہ اس کی شہرت سے جلنے لگی ہے۔

یہ بھی کیا تعلق تھا کہ واسطہ نہ ہوتے ہوئے بھی وہ راتوں کو اس کا انتظار کرتی تھی۔ شاید صبح کا بھولا رات کو آ جائے۔ اس کے کپڑے استری کر کے الماری میں لٹکا دیتی۔ اس کا کمرہ باقاعدہ صاف کر دیتی۔ چیخ کر بولتی...... پھر آواز دھیمی کر لیتی۔

ماں کہتی تھی، جس عورت میں شوہر دلچسپی لے رہا ہو اس عورت کا نام لے کر شوہر کو طعنہ نہیں دیتے کیونکہ وہ ضِد میں آ کر اسی سے شادی کر لیتا ہے۔ روزانہ اخبارات میں دونوں کی تصاویر دیکھتی۔ دونوں کو ایک ساتھ تقریبات میں دیکھتی۔ مسلسل حسد اور رقابت کی آگ میں جلتی رہتی۔ مسلسل گلے کو روگ لگ گیا۔ ایک کی بجائے دو آوازیں نکلنے لگ گئیں۔ مگر ایک کمزور سی اُمید اُس نے کہیں پر بچا کر رکھ لی تھی۔

لیکن ایک دن کیا ہوا کہ کمزور سی اُمید کا موہوم تنکا حقائق کی آندھی میں اُڑ گیا...... خبر لگ گئی کہ غفران علی نے دل آرا سے شادی کر لی ہے۔

غُرفہ نے ساری اجازتیں دے رکھی تھیں۔ سب جانتے ہوئے بھی اس نے اشارۃً بھی کبھی اسے دل آرا کا طعنہ نہیں دیا تھا۔

اِن ماؤں کو کون سمجھائے' پرانی صدی کے نسخے نئی صدی میں آزمانے لگ جاتی ہیں۔ اگر وہ غفران کو ڈراتی دھمکاتی رہتی تو شاید وہ انتہائی قدم نہ اُٹھاتا۔

ایک دن ہوا یوں کہ غفران کا ڈرائیور آ گیا، کہنے لگا: ''صاحب نے کہا'' ہے کہ ان کا سامان دے دیں۔

''صاحب سے کہو، خود آ کر اپنا سامان لے جائیں۔ سامان کوئی اور نہیں لے جاسکتا۔'' غُرفہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ وہ ایک بار اس کا سامنا کرنا چاہتی تھی۔ رُوبرو حساب چکانا چاہتی تھی۔

آدمی مر رہا ہوتا ہے اور شاہ رگ کے ساتھ جینے کی آس پھڑک رہی ہوتی ہے۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ غفران اتنا کمینہ بھی ہوسکتا ہے کہ اپنی نئی نویلی دُلہن کو لے کر اِس کے گھر میں آ جائے گا۔

جبران نے جب باہر شور مچایا...... ابی آ گئے...... ابی آ گئے...... تو وہ ننگے پاؤں دوڑتی ہوئی لاؤنج میں آ گئی۔ آنا بے اختیاری تھا۔

دروازہ کھلا۔ پہلے وہ داخل ہوا' بعد میں بنی ٹھنی دل آرا آئی۔ غفران نے اس کا بازو پکڑ کر اسے آگے کیا اور کہنے لگا: ''یہ ہے وہ خود پسند عورت جو کبھی میری بیوی تھی۔''...... پھر بڑے غرور سے تحکمانہ انداز میں بولا:

''وہ سامنے میرا کمرہ ہے' جاؤ میرا سارا سامان سمیٹ لاؤ' دیکھتا ہوں یہ کیسے روکتی ہے۔'' دل آرا کو آگے بڑھا کر' غفران نے کمرے کے وسط میں کھڑی ہوئی بیوی کو زور سے پرے ہٹایا۔ وہ ایسے گری جیسے کاغذ کی بنی ہوئی تھی۔ بولنا چاہا' بول نہ سکی' چیخنا چاہا، چیخ نہ سکی' اُٹھ کر کھڑی ہونا چاہا' کھڑی نہ ہوسکی۔

یوں لگا اس کے حلق میں شہتیر گر رہے ہیں۔

جب اُسے ہوش آیا تو وہ ہسپتال میں تھی' اور اس کی ایک دوست اس کے پاس بیٹھی تھی
جسے جبران نے فون کر کے بلا لیا تھا۔

اُس کی قوتِ گویائی سلب ہو گئی تھی۔

ایک ماہ تک وہ ہسپتال میں پڑی رہی۔ محکمے نے اس کی اعلیٰ کارکردگی کے تحت یہ مہربانی
کی کہ اسے علاج کے لیے امریکا بھجوا دیا۔ پاکستانی ڈاکٹروں کا بھی یہی خیال تھا کہ وہ شدید
صدمے کے زیرِ اثر ہے۔ اسے کچھ عرصہ کے لیے اس ماحول سے دُور کر دیا جائے۔ جبران
امتحان دے چکا تھا' وہ بھی ماں کے ساتھ چلا آیا تھا۔

یہاں بھی سارا بندوبست اس کی ایک کولیگ نے کیا تھا، جو دو سال پہلے امریکا آ گئی
تھی۔ اور اب اس کے لیے بطورِ خاص ایک ماہرِ نفسیات، لاس اینجلس سے بلوایا گیا تھا جس کی
ہدایت پر اس نے گزری ہوئی زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات لکھ دیے تھے۔

لکھتے ہوئے وہ کئی بار روئی تھی۔ اس پر کئی بار تشنج کی کیفیت طاری ہوئی تھی۔ اپنے آپ
سے نفرت کا احساس بھی پیدا ہوا تھا۔ اپنی جذباتی کوتاہیوں کا اندازہ بھی ہوا تھا۔

یہ سب لکھنے کے بعد وہ انتہائی سکون سے سو گئی تھی۔ ساری رات ایک ہی کروٹ سوتی رہی۔

☆☆☆

اگلی صبح مسکراتا ہوا ڈاکٹر اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ٹیک لگا کے بیٹھی کوئی کتاب
پڑھ رہی تھی، اتنی محویت تھی کہ اُسے ڈاکٹر کی آمد کا پتہ ہی نہ چلا......

ڈاکٹر آہستگی سے چلتا ہوا' جا کر اسی سٹول پر بیٹھ گیا اور نرمی سے بولا: ''ہاؤ آر یو مائی ڈیئر
لیڈی؟''

''اوہ، ڈاکٹر!'' وہ خوف زدہ انداز میں چیخی۔ پھر ششدرہ ہو گئی۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی
رہ گئیں۔''

''ڈاکٹر ......ڈاکٹر......'' اُس نے اپنے منہ میں اپنی زبان کو ہلتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ
کبھی اپنی گردن پر ہاتھ رکھتی، کبھی ڈاکٹر ......ڈاکٹر...... کہنے لگ جاتی۔ بولو...... بولتی جاؤ......

جلدی جلدی بولو...... اتنا بولو، جتنے دن چپ رہی ہو!

وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔

''مگر ڈاکٹر یہ کیسے ہوگیا...... کیسے ہوگیا ڈاکٹر......'' کیسے ہوگیا؟ کیسے ہوگیا؟''

''تمھارے حلق میں ایک بات پھنس گئی تھی۔ جب وہ نکلی تو گویائی بحال ہوگئی۔''

''ڈاکٹر، میں پھر تو گونگی نہیں ہو جاؤں گی!''

''نہیں...... تم پہلے بھی گونگی نہیں ہوئی تھیں۔ تمھارے گلے میں کچھ اٹک گیا تھا۔ باتیں حلق میں نہ پھنسایا کرو، Share کیا کرو۔ بانٹ لیا کرو۔''

''کس کے ساتھ ڈاکٹر......؟''

''میرے ساتھ...... اپنے بیٹے کے ساتھ...... کسی دوست کے ساتھ...... کسی دشمن کے ساتھ...... دشمن ہیں نا تمھارے...... کہ دشمن بھی کوئی نہیں رکھتیں......!''

وہ رو۔تے روتے ہنس پڑی...... پھر ہنستے ہنستے چلا چلا کر رونے لگی۔

وہ روتی رہی اور ڈاکٹر اس کا چہرہ غور سے دیکھتا رہا۔ چہرے پر یادوں کی تھکن تھی، شل کر دینے والی مسافت کی گرد تھی، وہ آبلہ پا نظر آرہی تھی...... اسے بہت دُور جانا پڑا تھا...... پھر اسی وقت لوٹ آنا پڑا تھا۔

''مجھے معلوم ہے۔'' ڈاکٹر اِس کا کندھا تھپتھپا کر بولا: ''یادوں کے کانٹے چننے میں تمھیں بہت تکلیف ہوئی ہے۔ مگر میں کیا کروں! اگر دھواں بہت زیادہ اُٹھ رہا ہو تو اُسے شعلہ بنانے کے لیے آگ دِکھانی پڑتی ہے۔ ایسی چیزیں سینت سینت کر نہیں رکھنی چاہئیں جن کی وجہ سے دل و جگر میں دھواں ہی دھواں بھر جائے!''

بولو: ''اب تم کیا کرنا چاہو گی؟''

''جب تک دھوئیں کے اندر ڈوبی تھی، کل کی کوئی آس نہیں تھی۔ آج مطلع صاف ہوا ہے تو سوچ کو جیسے پر لگ گئے ہیں۔''

''بہت صحت مند اور مثبت علامت ہے۔''

''ڈاکٹر! اب میں کچھ عرصہ یہاں رہنا چاہتی ہوں...... یہاں امریکا میں! اصل میں میرا بیٹا جو ساتھ آیا ہے، یہاں رہ کر اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتا ہے۔ میرے پاس سرمایہ نہیں ہے۔ نہ مَیں بیٹے کو اس شکستہ ماحول میں رکھنا چاہتی ہوں۔ کچھ عرصہ یہاں رہ کر کوئی جاب کرنا چاہتی ہوں تاکہ بیٹے کی ساری فیس جمع کروا کے جاؤں۔''

''ٹھیک ہے۔'' ڈاکٹر بولا...... یہاں رہنے میں کیا اُڑچن ہے؟''

''کوئی نہیں......'' وہ بولی......'' ہمارے ملک میں بغیر تنخواہ کے طویل چھٹی مل جاتی ہے۔ آپ مجھے اپنے ہسپتال میں ملازمت دلا دیں...... بس اتنی مدد کریں!''

''ہسپتال میں کیوں......؟ تم اپنے فیلڈ میں ملازمت تلاش کر سکتی ہو۔''

''فیلڈ میں کیسے......؟''

''ارے، اچھی لڑکی! یہاں کئی ایشیائی ٹی وی چینل ہیں جہاں ہر زبان کے پروگرام ہوتے ہیں۔ ایک چینل پر ہفتہ وار پروگرام دینے، میں بھی جاتا ہوں۔ سوال و جواب کا سیشن بھی ہوتا ہے۔ تم چاہو تو اِس پروگرام میں مجھے اسِسٹ کر دیا کرو۔ اس کے بعد تمھارے لیے راستے کھل جائیں گے۔''

''سچ ڈاکٹر؟'' اس کی روئی ہوئی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ ''پھر تو میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گی۔''

''تم اب بھی بالکل ٹھیک ہو۔ میں نے تمھارے ''ذہنی'' سکون کے لیے کچھ دوائیں لکھ دی ہیں۔ ابھی ایک ہفتہ تم اسی ہسپتال میں رہو گی۔ پھر جہاں جاؤ گی، مجھ سے رابطہ رکھنا! بلکہ پاکستان جانے کے بعد بھی رابطہ رکھنا۔ میں اپنے مریضوں کے خطوط پر مشتمل ایک کتاب لکھ رہا ہوں، جس میں ان کے تجربات بھی شامل کرنا چاہتا ہوں۔''

☆☆☆

ڈاکٹر بل!

سب سے پہلے معافی مانگوں گی۔ میں ایک عرصہ تک آپ کو طویل خط نہ لکھ سکی حالانکہ

امریکا سے آتے وقت میں نے وعدہ بھی کیا تھا۔ آتے ہی میں نے آپ کو ایک شکریے کا خط لکھ دیا تھا۔ پھر بس روایتیں نبھانے کے لیے، کبھی نیو ایئر پر اور کبھی کرسمس پر آپ کو کارڈ بھیجتی رہی۔ ہر بار سوچتی کہ آپ کو یہاں کے حالات ضرور لکھوں گی...... مگر حالات اِتنے گمبھیر ہو چکے تھے کہ میں ان میں گھر گئی۔ ہاں باور رہے کہ میں دھوئیں میں نہیں پھنسی۔ میں تو وہاں سے ایک نیا حوصلہ اور تازہ ولولہ لے کر آئی تھی۔

ڈاکٹر، میں نے امریکا میں دو تجرباتی سال گزارے۔ مختلف شعبوں میں کام کیا۔ الیکٹرانک میڈیا پر ایک تحقیقی امتحان بھی پاس کیا۔ ان دو سالوں نے مجھے دو صدیوں کا حوصلہ دیا۔ میں بیٹے کو وہاں سیٹل کر کے یہاں آ گئی۔

میرے دو سالہ تجربے اور ڈپلومے کے باعث نہ صرف میری پرانی ملازمت بحال ہو گئی بلکہ کچھ عرصہ بعد مجھے ترقی دے کر سٹیشن ڈائریکٹر بنا دیا گیا۔

میں نے آپ کو بتایا تھا نا، مجھے ماں کی طرف سے ایک گھر ملا تھا جو میرے جانے کے بعد میرے شوہر کی تحویل میں آ گیا تھا۔ بیٹا چھوٹا تھا۔ میں بیمار تھی۔ بس کسمپرسی کے عالم میں ہم لوگ یہاں سے اُٹھ کر چل دیئے۔ وہاں بھی دوستوں کے خطوط سے مجھے حالات کا پتہ چلتا رہتا تھا۔ مگر یہاں آنے پر کچھ اور طرح کے حقائق کھلے......

میرے شوہر نے میرا وہ گھر گروی رکھ کے اِس کے عوض پچاس لاکھ روپیہ نکلوا لیا تھا۔ میری الماری کھول کے سارے کاغذات پر قبضہ کر لیا تھا۔ سنا ہے، اس نے بڑے زور شور سے فلم بنائی جو بُری طرح ناکام ہو گئی۔ قرض داروں نے اس کی زندگی اجیرن کر دی۔ عالم آرا بھی لڑ جھگڑ کر اس کو چھوڑ گئی۔ کثرتِ شراب نوشی کے سوا کوئی اس کا دوست نہ رہا تھا۔ دُور پار کے عزیز واقارب نے بھی کوئی مدد نہیں کی...... آخر ایک دن فالج کا حملہ ہوا...... اور دوستوں نے ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ فالج کے حملے میں اس کا بایاں بازو اور زبان مفلوج ہو گئی۔ مجھے ان باتوں کا بہت بعد میں پتہ چلا۔ آتے ہی مجھے گھر کی طرف سے پریشانی کا سامنا ہوا۔ اس قدر قرض لینے کے باوجود سود کی ایک قسط بھی ادا نہیں ہوئی تھی، اور میرا گھر قرق ہونے والا تھا۔

میں نے آتے ہی بھاگ دوڑ کی۔ کچھ سرمایہ وہاں سے جمع کر کے لائی تھی۔ کچھ پرانے دوستوں سے قرض لیا۔ اور سود کی قسطیں ادا کیں۔ گھر کو مرمت کروایا۔ رینوویٹ کیا اور کرائے پر چڑھا دیا۔ اور دس سال تک کا کرایہ اس بنک کے نام لگا دیا جہاں سے غفران نے قرض لیا تھا۔

میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میری ماں کا گھر بہت خوبصورت اور بہت کشادہ تھا اس گھر کے پچھلے لان میں، میں نے دو کمروں کی ایک انیکسی بنائی، اور خود اس میں رہائش اختیار کر لی۔ زندگی بندے کو ہمیشہ جینے کا قرینہ سکھاتی ہے۔ ان کاموں میں چار سال لگ گئے۔ پھر میں نے ریڈیو کی نوکری چھوڑ دی۔ قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی۔ اور ٹی وی کی پرائیوٹ کمپنیوں کے لیے سکرپٹ لکھنے کا معاہدہ کر لیا۔ یہ کام زیادہ بہتر ہے۔ گھر بیٹھ کر سکون کے ساتھ کر سکتی ہوں۔ یوں مجھے کمپیئرنگ کے لیے بھی آفرز آجاتی ہیں۔

ایک روز ہمارے کچھ پرانے اور مشترکہ دوست میرے گھر آئے۔ اور اُنھوں نے مجھے بتایا کہ غفران کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ وہ ایک خیراتی ہسپتال میں پڑا ہے۔ میں اسے معاف کر دوں، اور اپنے گھر لے آؤں......

ڈاکٹر! میں نے تو اسے بہت پہلے معاف کر دیا تھا۔ اب تو مجھے کوئی ملال بھی نہیں تھا۔ تاہم انسانیت کے ناطے، اس کے دوست اُسے میرے گھر پر چھوڑ گئے۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے گہرا صدمہ پہنچا...... یہ تھا وہ شاندار شخص، خوش لباس، خوش گفتار، جس کی پوری شخصیت کو ہمہ وقت کلف لگا رہتا تھا...... چند سالوں میں نہ وہ صورت رہی تھی، نہ سراپا...... وہ تو صدیوں کا مریض بن گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ اب اس کا علاج ممکن نہیں۔ شراب نوشی نے اس کے اعصاب ختم کر دیئے ہیں۔

ایک کمرہ اس کے لیے ٹھیک کر دیا۔ ایک ملازم کا بھی بندوبست کر دیا۔ علاج بھی اس کا جاری رکھا۔ وہ سارا دن اپنے آرام دہ بستر پر لیٹا رہتا ہے۔ اس کی انگارے برسانے والی زبان بند رہتی ہے۔ اس کے چہرے پر صرف آنکھیں بولتی ہیں۔

میں اس کی طرف دیکھتی ہوں تو میرا کلیجہ کٹنے لگتا ہے...... مجھے یاد آرہا ہے، جب وہ مجھ

سے بول چال بند کر دیتا تھا، تو میری سانس بند ہونے لگتی تھی۔ مجھے اس کے ساتھ ہر دم باتیں کرنا اچھا لگتا تھا۔ اس کو میری اس کمزوری کا پتہ لگ گیا تھا...... مگر یہ تو اس کے سان گمان میں بھی نہ ہوگا کہ قدرت ایک روز اس سے یہ زبان ہی چھین لے گی۔ یہاں انسان کا اپنا کیا ہے' اور اپنی کس چیز پر اسے اختیار ہے! پھر وہ اَنا کے مینار کو اتنا اُونچا کیوں کر لیتا ہے؟

ڈاکٹر صاحب! آپ نے مجھے بتایا تھا کہ آپ نے انسانی نفسیات پر دو سو کتابیں لکھی ہیں مگر پھر بھی آپ کو یوں لگتا ہے کہ آپ اِنسانی نفسیات کی الف ب سے بھی واقف نہیں ہیں کیا اتنی الجھی ہوئی ہے انسانی فطرت! مگر اب میں ایک فرمائش کر رہی ہوں۔ ایک کتاب محبت کی نفسیات پر بھی لکھیں!

میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا کہ آخر یہ محبت ہے کیا......؟ محبت جس پر مرتی ہے' آخر اسی کو مار ڈالتی ہے' کیوں......؟

میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آیا، آخر شادی کیا ہوتی ہے...... شادی ہر مرد اور ہر عورت کی ضرورت ہے۔ مگر کتنوں نے شادی کے تقاضوں کو سمجھا ہے۔ شادی بھی ایک مذہبی کنٹریکٹ ہوتا ہے۔ ہر معاہدے کے کچھ قوانین ہوتے ہیں۔ اسی کی رو سے وہ معاہدہ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ مگر شادی میں ہم کوئی قانون یا قاعدہ کیوں نہیں مانتے۔ ہر کاروبار میں کچھ فائدے اَور کچھ نقصان برداشت کیے جاتے ہیں۔ شادی میں صرف سود پیشِ نظر کیوں ہوتا ہے۔ زیاں کی گنجائش کیوں نہیں رکھی جاتی۔ میں اِعتراف کرتی ہوں، مجھے اپنی آواز کا کیریئر بہت عزیز تھا۔ لیکن اگر میرا شوہر میری نفی کرنے کے لیے شوبز میں آنا چاہتا تھا تو مجھے اعتراض کیوں تھا۔ میں نے اس کو اپنی انا کا مسئلہ کیوں بنا لیا کہ اس نے علیٰحدہ راستے اختیار کر لیے...... میں نے اپنا راستہ اسے کیوں نہ دے دیا؟ اور اگر غفران نے میری آواز کے عشق میں مبتلا ہو کر مجھ سے شادی کی تھی تو پھر اس آواز کو جھٹلانا ہی اس کی زندگی کا مقصد کیوں بن گیا تھا۔ اپنے عشق کو دوام بخشنے کے لیے وہ میری آواز کی دُنیا سے دُور رہتا...... مجھے میری دُنیا بخش دیتا...... سخاوت کرتا...... تو بھی زندگی کی گاڑی چلتی رہتی۔

فرشتے تو ہم دونوں بھی نہیں تھے......

ڈاکٹر! عورت، پامال ہونا پسند نہیں کرتی۔ صرف دل کے آگے ہار مانتی ہے۔ دل اسے کمزور کر دیتا ہے۔ اس کا دل ہمیشہ محبت' اور ماتا کے آگے سرنگوں رہتا ہے۔

ڈاکٹر! آپ اپنی کتاب میں لکھنا...... ضروری نہیں کہ عورت کی نفی کر کے اور اس کو ذلیل کر کے اپنے آگے جھکایا جائے۔ اسے جھکانے اور سجدے کروانے کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں...... جب اس کی ہستی کو تسلیم کر لیا جائے تو بلی کی طرح آ کر پاؤں میں بیٹھ جاتی ہے۔ پھر اگر ٹھڈا بھی لگائیں تو غراتی نہیں۔

اور مجھے یہ بتائیں ڈاکٹر! ہم جن سے محبت کرتے ہیں، ان پر احسان کیوں کرتے ہیں! بیوی، دُنیا جہاں کے خواب ایک شوہر سے وابستہ کر لیتی ہے اور شوہر دُنیا جہاں کی توقعات ایک بیوی سے وابستہ کر لیتا ہے ایک مرد یا ایک عورت اتنا ہی کر سکتے ہیں جتنا ان کے اختیار میں ہو۔ محبت کے عہد کو نبھانے کے لیے اپنے نفس کی تربیت کرنا پڑتی ہے۔ اور اپنی فطری جبلتوں کی مہار اپنے ہاتھ میں رکھنی پڑتی ہے...... میں جتنا سوچتی ہوں پشیمان ہو جاتی ہوں۔ ہمارے ہاں ہر قسم کی ٹریننگ دی جاتی ہے...... مگر دو انسانوں کو ایک ساتھ، ایک کمرے میں ایک گھر میں رہنے کی کوئی تربیت نہیں دی جاتی...... آپ کے ہاں اور منظر ہے...... ہمارے ہاں اور معاملہ ہے......!

ڈاکٹر! پچھلے مہینے جبران نے مجھے لکھا کہ اسے ایک چینی لڑکی سے محبت ہو گئی ہے اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

میں اگر پہلے والی ماں ہوتی تو سیخ پا ہو جاتی کیونکہ میں نے اپنے سارے ارمان اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی کے ساتھ وابستہ کر رکھے ہوتے...... اپنی محرومیوں اور ناآسودگیوں کی کسر بھی اسی پر نکال رکھی ہوتی......

مگر اب مجھے غصہ نہیں آیا' میں نے اُسے کوئی نصیحت نہیں کی۔ صرف اِتنا لکھ دیا ہے کہ اگر تم شادی کا بوجھ اُٹھا سکتے ہو تو کر لو شادی!

ویسے میں تو اب جان گئی ہوں کہ بائیس سال کے نوجوان کو کیا معلوم، محبت کیا ہے...... اور شادی کیا ہوتی ہے...... یہ تو صرف جذبوں کے چاند کو چھونے کی عمر ہوتی ہے...... ابھی زندگی اسے بہت کچھ سکھائے گی......!

ابھی اسے کیا معلوم کہ یہاں کسی شے پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔

آج کل مَیں حیات و موت کے فلسفے پر بہت سوچنے لگی ہوں۔ میں غفران کی صورت دیکھتی ہوں، اپنا آپ آئینے میں دیکھتی ہوں تو حیران ہو جاتی ہوں۔ دیکھتے دیکھتے اِنسان کتنا بدل جاتا ہے۔ جب اُسے اپنی صورت پر اختیار نہیں تو اُسے اپنے جذبوں پر کیا اختیار ہو سکتا ہے۔ اس کی کوئی شے اس کی اپنی نہیں تو دوسروں پر کیوں اختیار رکھنا چاہتا ہے...... کتنی معیاد ہے اس انسان کی!

اگر بچپن کو بیس سال تک شمار کیا جائے تو اس کے پاس بہترین وقت صرف تیس سال تک کا بچتا ہے...... صرف تیس سال اس کی ملکیت ہوتے ہیں۔ ان تیس سالوں کو وہ تیس صدیاں سمجھ لیتا ہے۔ بگٹٹ بھاگنے لگتا ہے۔ اَنا کا چابک ہاتھ میں پکڑ لیتا ہے۔ اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ قدرت کی پلاننگ پر غور نہیں کرتا۔ وہ اپنی پلاننگ کے گھوڑے پر سوار ہوتا ہے۔ وہ مَیں مَیں کی دھن کا عادی ہو جاتا ہے۔

مگر یہ جو تیس یا چالیس سال ملتے ہیں، یہ بندے کا کیا حشر کر کے جاتے ہیں......

یہ کسی کو معلوم نہیں ہوتا!

ڈاکٹر بل! اِس مرتبہ آپ میرا خط پڑھ کر بہت حیران ہوں گے۔ حیران نہ ہوئیے گا۔

انسان جب تک بولتا رہتا ہے، چیختا رہتا ہے، خود اپنی ذات کا عرفان نہیں پا سکتا۔ یہ زبان اس کے درمیان ایک پردہ حائل کر دیتی ہے۔ اپنی ذات کو کھوجنے کے لیے زبان کا چپ ہونا بہت ضروری ہے۔

اب میں جس گھر میں رہتی ہوں، وہاں سناٹوں کا راج ہے لیکن اب مجھے سناٹوں سے وحشت نہیں ہوتی۔ کیونکہ میں نے اپنی آواز سے محبت کرنا چھوڑ دیا ہے۔

ایک کمرے میں غفران پڑا رہتا ہے۔ کبھی کبھی وہ وھیل چیئر پر بیٹھ کر باہر لان میں آ بیٹھتا ہے۔ بس ہر شے کو دیکھتا رہتا ہے کیونکہ اسے دیکھتے رہنے کی میعاد دی گئی ہے۔ اب وہ کسی کے ساتھ بولنا بھی چاہے تو بول نہیں سکتا۔ اب زبان خود اس سے رُوٹھ گئی ہے......

یہ تولہ بھر کی زبان جو اِس حیوانِ ناطق کو' اِنسانیت کا مقام عطا کرنے کے لیے دی گئی تھی، اس سے وہ زیادہ تر دل آزاری کا کام لیتا ہے۔ اس کو تلوار کی طرح استعمال کرتا ہے۔ جو رشتوں کو کاٹ دیتی ہے اور محبتوں کو چھانٹ دیتی ہے۔ اسی زبان سے وہ چاہے تو دُنیا کو تسخیر بھی کر سکتا ہے' مگر یہ زبان بھی تو ہمیشہ اس کی نہیں رہتی۔

میری ماں کا یہ فلسفہ بھی غلط ثابت ہو گیا کہ جوانی کی چخ چخ ایک آسودہ بڑھاپے کے لیے برداشت کر لینی چاہیے! یہاں اپنے بڑھاپے کے لیے کون تیار ہو کر آتا ہے!

ڈاکٹر بل! جب میں نے چُپ کا سمندر اوڑھا تو میرے اندر کے سارے سناٹے بولنے لگے۔ تب باہر کی خاموشیاں مجھ سے باتیں کرنے لگیں۔ غور کیا تو کائنات کی ہر شے محوِ تکلّم تھی...... آسمان پر تیرتے بادل، ہوا کے پاؤں میں بجتی پتوں کی پائلیں، ڈوبتا ہوا دِن، سورج کو اشارہ دیتا ہوا صبح کاذب کا آنچل، مراقبے میں ڈوبے درخت، سب ہی کچھ کہتے رہتے رہیں!

کیتلی اگر زیادہ دیر چولھے پر رکھی رہے تو چیخنے لگتی ہے۔ پنکھا اگر ساری رات چلتا رہے تو صبح کو تھکا تھکا لگتا ہے۔ شام کی چڑیاں وارفتگی کا گیت گاتی ہیں...... اکٹھی آتی ہیں' اکٹھی اُڑ جاتی ہیں، کسی کی آواز کسی سے الگ نہیں لگتی، یہ ساری دُنیا کو ہم آہنگی اور یک جہتی کا راز بتاتی ہیں، علی الصبح پھر آ دھمکتی ہیں اور کہتی ہیں: ہم تو سورج کو بھی جگانے والیاں ہیں......

ابتدائی راتوں کا چاند کلیاں بکھیرتا آتا ہے...... کہتا ہے: چُن سکتے ہو تو چُن لو! پچھلی راتوں کا چاند آنسو بہاتے گزرتا ہے جنھیں پھُول اور پتے اپنی جھولیوں میں بھر لیتے ہیں......

بادلوں کی آنکھیں نیلی ہیں مگر دل سنہرا ہے!

پہلے میں سمجھا کرتی تھی، چُپ زہر ہے اور سناٹے موت کے سائے ہیں! اب مجھ پر کھلا کہ چُپ تو معرفت ہے...... چُپ تو سمندر ہے...... چُپ تو جوگ ہے...... چُپ تو پاسِ

انفاس ہے...... چُپ تو تزکیہ نفس ہے...... چپ تو گویائی کا مینار ہے...... اندر کی ہر گرہ کھلتی جاتی ہے...... ہر روزن روشن ہوتا جاتا ہے تو باہر کے گلے شکوے ختم ہو جاتے ہیں...... اسی کو شاید خود شناسی کہا گیا ہے۔ مگر کتنی کانٹوں بھری راہوں کو عبور کر کے بندہ یہاں تک آتا ہے! پر جب آجائے تو سہاروں سے بے نیاز ہو کر اس جہانِ مرغ و ماہی کی ساری مصلحتیں سمجھنے لگ جاتا ہے...... اندر بولنے لگتا ہے تو زبان مارے شرم کے خاموش ہو جاتی ہے!

اور وہ...... جس نے اور میں نے زندگی کی صبحیں اور شامیں ایک ساتھ بسر کرنے کا قصد کیا تھا، بڑھاپے کی ڈگر پر آگے پیچھے جانے پر صاد کیا تھا......

وہ ایک کمرے میں لوتھڑے کی صورت پڑا ٹکر ٹکر دیکھا کرتا ہے......

میں دوسرے کمرے میں بیٹھی، گرتے پتّوں کی چاپ سُنا کرتی ہوں......

چُپ...... چُپ...... چُپ...... چُپ......!

میں ہوں......

آپ سے زندگی کرنے کا گُر سیکھنے والی،

غُرفہ

☆☆☆